تاریخ و تذکرہ فتح پور شیخاواٹی
نذیر فتح پوری

نواب دولت خان دوم

نواب دیندار خان

نواب سردار خان اوّل

فتح پور شہر کا ریلوے اسٹیشن
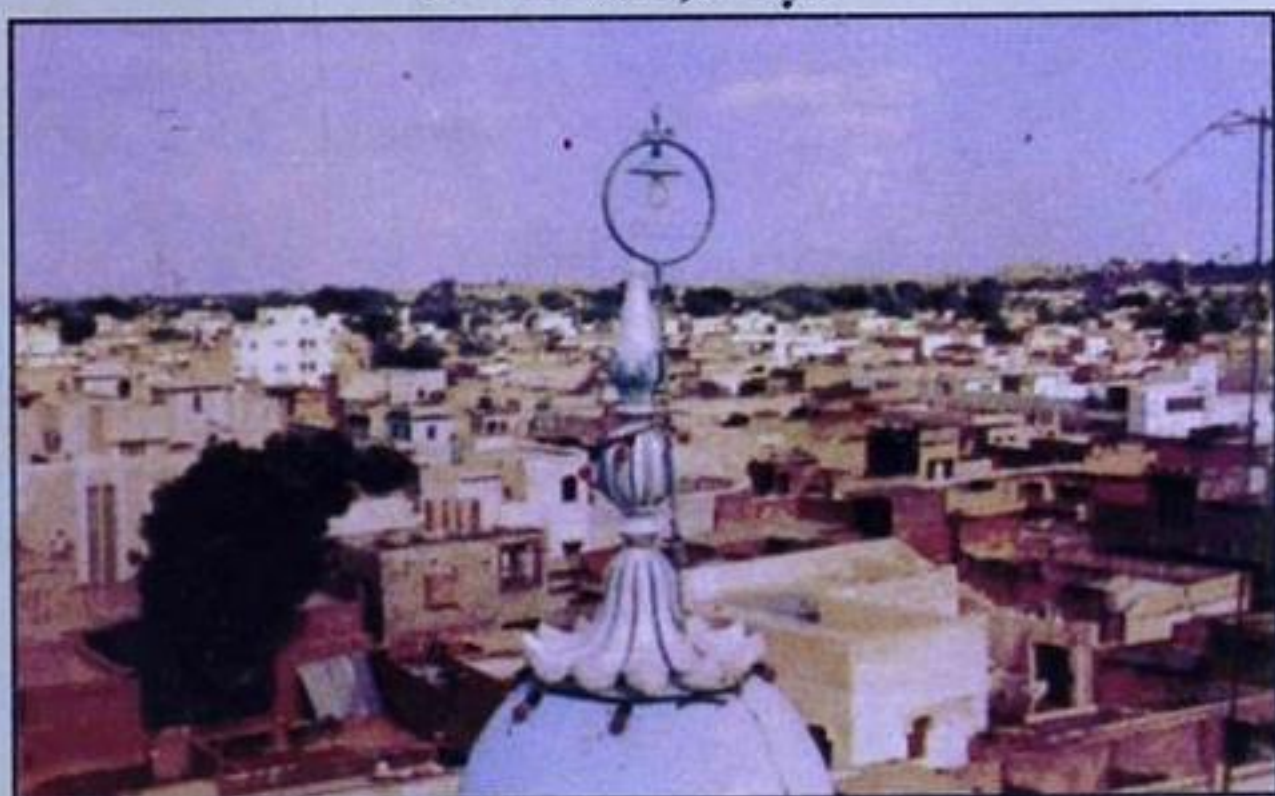
فتح پور شہر کا ایک ہوائی منظر

نواب الف خان کا مقبرہ

باؤڑی گیٹ
ایک عجوبۂ روزگار
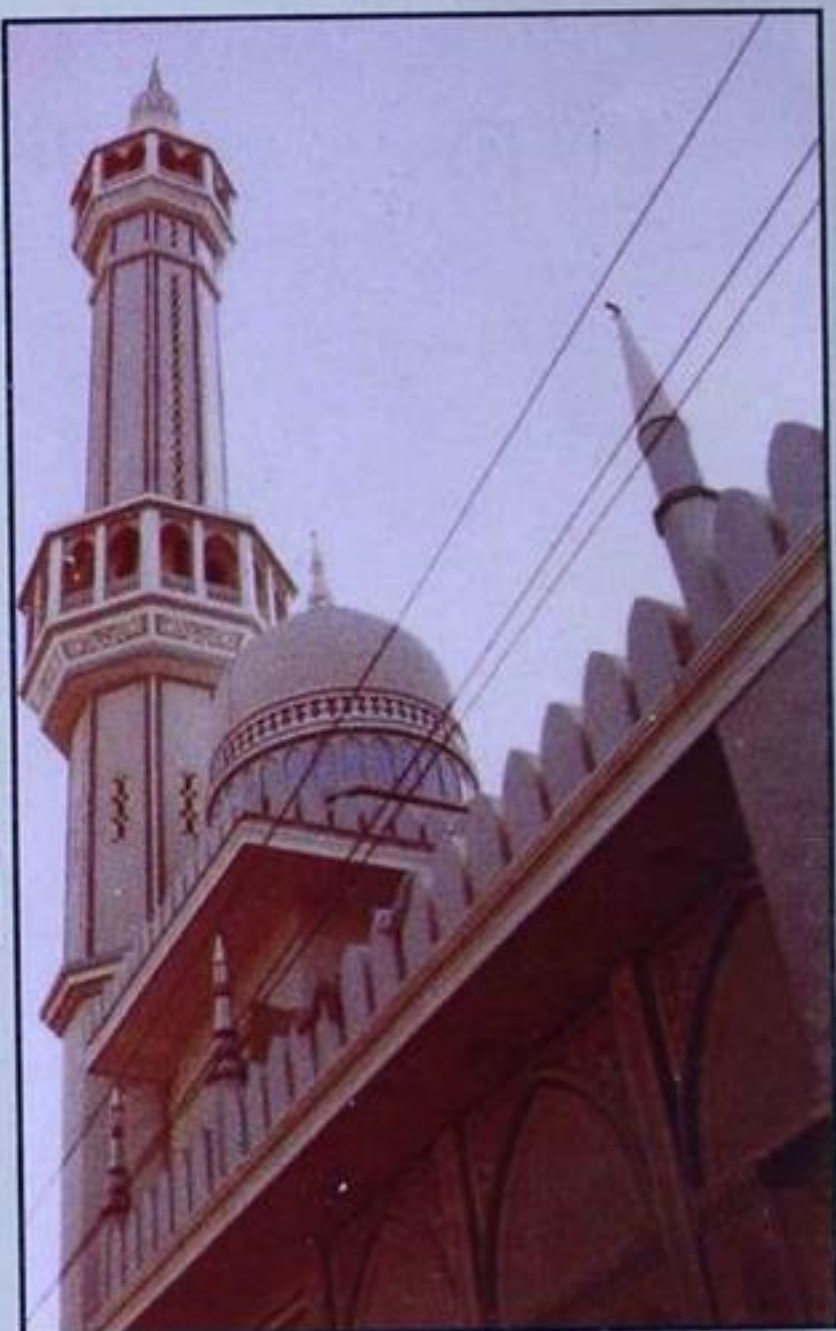
مسجد حضرت عائشہؓ صدیقہ

فتح پور کا جین مندر جس کی تعمیر میں نوابوں کا تعاون رہا
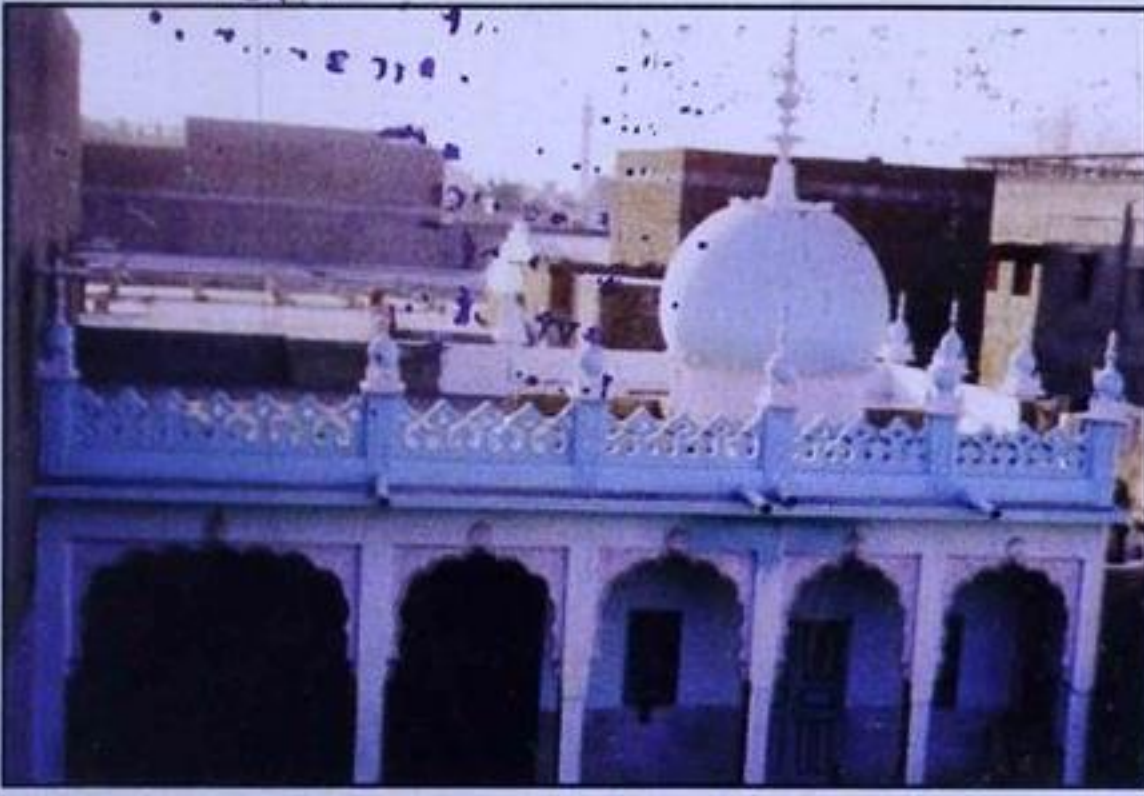
درگاہ شریف نواب درِ دولت خان

فتح پور شیخاواٹی کے چند نمائندہ شعراء جناب منصور چوروی کے ساتھ

شیخاواٹی کی بھوری کے ایک ٹیلے پر راقم الحروف اور غلام دستگیر ضیاء

تاریخ و تذکرۂ فتح پور شیخاواٹی

(راجستھان)

نذیر فتح پوری

اسباق پبلی کیشنز، پونہ - سلسلۂ مطبوعات 41

نام کتاب	:	تاریخ و تذکرۂ فتح پور شیخاواٹی
مرتب	:	نذیر فتح پوری
سن طباعت	:	اپریل ۲۰۰۳ء
صفحات	:	۱۷۶
قیمت	:	160 روپے
کتابت و سرورق	:	مدنی گرافکس پونہ، 6122855
مطبع	:	پربھات پرنٹنگ ورکس، پونے

ملنے کے پتے :

❖ نذیر فتح پوری، مدیر 'اسباق'

230/B/102، وِمان درشن، سنجے پارک، لوہ گاؤں روڈ،

پونے 411 001۔ فون : 6687138

❖ شبیر فراز فتح پوری

مسجد درِ دولت بازار، فتح پور شیخاواٹی

سیکر، راجستھان

تذکرہ نگار کا اِجمالی تعارف

نام : نذیر احمد خان جوڑ (نذیر فتح پوری)

ولدیت : حاجی ابراہیم خان علیم خان جوڑ

وطن : فتح پور شیخاوائی، راجستھان

سن پیدائش : یکم دسمبر ۱۹۴۶ء بمقام محلہ خانجی کی حویلی، فتح پور شیخاوائی، ضلع سیکر، راجستھان

تعلیم : اسلامیہ اسکول عیدگاہ، فتح پور شیخاوائی

مستقل پتہ : 'سائرہ منزل' 230/B/102، وِمان درشن، سنجے پارک، لوہ گاؤں روڈ، پونے ۴۱۱۰۳۲ فون: 020 - 6687138

انعامات و اعزازات:

- ❖ ۱۹۹۲ء میں راجستھان اسٹیٹ اُردو اکیڈمی نے ایوارڈ دیا۔
- ❖ ۱۹۹۳ء میں آل انڈیا میر اکیڈمی نے "میر تقی میر" ایوارڈ دیا۔
- ❖ ۱۹۹۴ء پونہ میں "چراغِ غزل" ایوارڈ دیا گیا۔
- ❖ ۱۹۹۵ء میں مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکیڈمی نے انعام دیا۔
- ❖ ۱۹۹۹ء میں پونے میونسپل کارپوریشن کی جانب سے پونہ کے میئر کے ہاتھوں اعزاز دیا گیا۔
- ❖ ۲۰۰۰ء میں راجستھان اُردو اکیڈمی نے انعام دیا۔
- ❖ ۲۰۰۱ء میں مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکیڈمی نے انعام دیا۔
- ❖ ۲۰۰۰ء میں بہار ساہتیہ سنسد سمستی پور کی جانب سے "خواجہ احمد عباس ایوارڈ" ملا۔
- ❖ آل انڈیا قومی یکجہتی کمیٹی فرید آباد نے ایک نظم پر "آل انڈیا قومی یکجہتی ایوارڈ" سے نوازا۔
- ❖ حکومت مہاراشٹر کے شعبۂ فلاح و بہبود کی جانب سے ان کے نکڑ ناٹک "گرد" کو پہلا انعام دیا گیا۔
- ❖ دہلی سے اُستاد رشید رامپوری ایوارڈ ملا۔
- ❖ بنگلور سے غالبؔ ایوارڈ ملا۔
- ❖ تنظیم جماعت المسلمین فتح پور کی جانب سے شال اور ے منتو دے کر اعزاز کیا۔

❖ انڈین کمپیوٹر ایجوکیشن فتح پور کی جانب سے اعزاز۔
❖ یکم جون ۲۰۰۰ء کو اسلامیہ اسکول عیدگاہ فتح پور کی جانب سے عوامی جلسہ میں ایس. ڈی. ایم. جناب اے ڈی مہرڈا کے ہاتھوں اعزاز دیا گیا اور سپاس نامہ پیش کیا گیا۔
❖ اُردو رسالے توازن (مالیگاؤں)، تکمیل (ممبئی)، مفسر (اورنگ آباد) نے ان کے فکر و فن پر خصوصی گوشے شائع کیے۔
❖ بزم فروغِ اَدب فتح پور نے عادل فتح پوری کی کتاب 'نذیر فتح پوری -ایک دوست ایک شاعر' شائع کی۔
❖ راجستھان اسٹیٹ اُردو اکیڈمی نے "مونوگراف" شائع کیا۔
❖ ٹونک راجستھان کے مشہور ادیب ڈاکٹر رفعت اختر نے "نذیر فتح پوری- شخصیت اور فن" مرتب کی۔
❖ ۲۰۰۳ء میں ضیاء فتح پوری نے تعارف نامہ مرتب کر کے شائع کیا۔
❖ ۱۰ مارچ ۲۰۰۳ء کو انگریزی اخبار "انڈین ایکسپریس" نے تفصیلی انٹرویو شائع کیا۔
۴۰ سال میں اکیس کتابیں شائع ہو کر مقبولِ خاص و عام ہو چکی ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے

❖ چٹانوں کے بیچ (ناول) ۱۹۷۵ء ❖ زخم اور آہیں (ناول) ۱۹۷۷ء
❖ بجو! آؤ گیت سنائیں (نظمیں) ۱۹۸۳ء ❖ لمحوں کا سفر (غزلیں) ۱۹۸۵ء
❖ غزل اندر غزل (آزاد غزلیں) ۱۹۸۸ء ❖ سفر تا سفر (غزلیں) ۱۹۹۱ء
❖ تیسرا سفر (غزلیں) ۱۹۹۳ء ❖ لفظوں کے سائے تلے (مضامین) ۱۹۹۵ء
❖ ریگِ رواں (ماہیے) ۱۹۹۷ء ❖ اِکرام (نعتیہ) ۱۹۹۸ء
❖ جگناتھ آزاد ایک مستقل ادارہ ۱۹۹۸ء ❖ اُردو افسانے کی مقبول ترین آواز ۱۹۹۹ء
❖ کوثر صدیقی - فن اور شخصیت ۲۰۰۰ء ❖ غالب...... گپتا رضا اور ہنچے ۲۰۰۰ء
❖ مٹھی بھر ماہیے ۲۰۰۱ء ❖ دلدار ہاشمی...... فن اور شخصیت ۲۰۰۱ء
❖ علامہ کالی داس گپتا رضا نمبر ۲۰۰۲ء ❖ حیدر قریشی...... فن اور شخصیت ۲۰۰۲ء
❖ یہ زمین میری ہے (ناگری لیپی میں مجموعۂ کلام) ۲۰۰۳ء

❖ گذشتہ بائیس سالوں سے اُردو رسالہ "اسباق" ترتیب دے کر شائع کر رہے ہیں۔
❖ دیگر اُدباء و شعراء کی ۴۵ر کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کر چکے ہیں۔
❖ راجستھان اسکولوں کی جماعت ہائے چہارم و ششم کی اُردو نصابی کتابوں میں ان کی نظمیں شامل ہیں۔

❖❖❖

انتساب
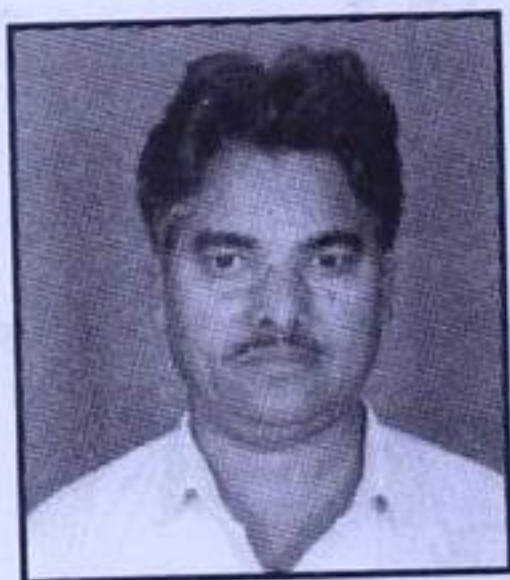
شبیر فرازؔ فتح پوری

کے نام

نذیرؔ فتح پوری

فہرست

صفحہ نمبر

❁❁❁

ایک نظم فتح پور کے نام

احساس وطن کا لہرایا
پردیس میں کیا کیا یاد آیا
یہ کیسی وطن کی یادیں ہیں
کچھ آہیں ہیں فریادیں ہیں
کیا اور لکھوں اس کاغذ پر
ہوں زخم لکھے جس کاغذ پر
تنہائی میں آنسو ٹپکے ہیں
یہ میرے جگر کے ٹکڑے ہیں
ان ٹکڑوں میں فریادیں ہیں
یہ میرے وطن کی یادیں ہیں
پردیس میں کیا کیا یاد آیا
جب صبح اُتر کر آتی تھی
دھرتی پر پیار بچھاتی تھی
ہل لے کر لوگ نکلتے تھے
کھیتوں میں سپنے بوتے تھے
محنت کا پسینہ پھلتا تھا
دھرتی سے پیار اُبلتا تھا
فصلوں کی کٹائی ہوتی تھی
دھانوں کی صفائی ہوتی تھی
پردیس میں کیا کیا یاد آیا
جب شام سہانی ہوتی تھی
کیا رات مزے میں سوتی تھی
کیا باتیں تھیں دل والوں کی
تہذیب تھی کیا چوپالوں کی
کیا قصے کہانی کہتے تھے
خوش بچے بوڑھے رہتے تھے
تاریخ وہ رانا سانگا کی
گویا کہ زباں پر سب کے تھی
پرتاپ کی باتیں کرتے تھے
کب تلواروں سے ڈرتے تھے
پردیس میں کیا کیا یاد آیا
جب رات جگائی جاتی تھی
دھونی بھی رمائی جاتی تھی
سنگیت پہ سنگت ہوتی تھی
طبلے کی رنگت ہوتی تھی
میرا کے بھجن سب گاتے تھے
سب بنسی پر لہراتے تھے
لے جذبوں کی بڑھ جاتی تھی
اک مستی سی چڑھ جاتی تھی
پردیس میں کیا کیا یاد آیا
جب تیج کا میلہ آتا تھا
رنگ رلیاں کیا کیا لاتا تھا
بازار سجائے جاتے تھے
کیا ڈھول بجائے جاتے تھے
رنگین ڈوپٹے اُڑتے تھے
کیا رنگ ہوا میں گھلتے تھے
نٹ اور نٹنی لہراتے تھے
کیا ڈھولا مارو گاتے تھے
پردیس میں کیا کیا یاد آیا

نذیرؔ فتح پوری

گفتِ باہمی

کسی بھی کام کی ابتدا انسان اپنی مرضی سے کر سکتا ہے۔ لیکن اختتام اس کے اختیار میں نہیں۔ ایسا ہی کچھ زیر مطالعہ کتاب کے سلسلے میں میرے ساتھ ہوا۔ فتح پور سے لوٹتے ہی میں نے ۱۴ر اگست ۲۰۰۱ء کو ''تذکرۂ شعرائے فتح پور'' کا پہلا صفحہ لکھا، اس کے بعد ایسی دُھن سوار ہوئی کہ ۱۴ر ستمبر ۲۰۰۱ء کو کتاب مکمل کر کے دستخط کر دیے۔ پھر اس کی اشاعت کے لیے راجستھان اُردو اکادمی جے پور کے سابق سکریٹری معظّم علی سے رابطہ قائم کیا، انھوں نے کہا، پہلی فرصت میں مسودہ ارسال کر دیں، دراصل فتح پور سے لوٹتے وقت جے پور میں معظّم علی سے مل کر تذکرے کی اشاعت کے لیے انھیں آمادہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد ہی ترتیب و تدوین کا کام شروع کیا تھا۔ جیسے ہی کام مکمل ہوا مسودہ اکادمی کو ارسال کر دیا۔ دو ماہ انتظار میں آنکھیں بچھائے بیٹھا رہا، لیکن اکادمی کی جانب سے مسودے کی رسید بھی نہیں ملی۔ حالانکہ گذشتہ دو سال میں اکادمی کی جانب سے تذکرہ شعرائے کوٹا، تذکرہ شعرائے ادے پور اور تذکرہ شعرائے بیکانیر شائع ہو چکے تھے۔ اس سے قبل تذکرہ شعرائے جودھپور اور تذکرہ شعرائے اجمیر کی اشاعت بھی عمل میں آچکی تھی۔ میرا تحریر کردہ 'تذکرہ شعرائے فتح پور' بھی اکادمی ہی کے مشن کا ایک حصہ تھا۔ جب میں نے متعدد خطوط لکھ کر معظّم علی سے صورتحال معلوم کرنے کی کوشش کی تو انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن فون پر انھوں نے جو صورتحال بتائی اس سے مجھے دُکھ پہنچا۔ اسی دوران جان کوی نعمت خان اور اکبر کی بیوی تاج کویتری کے تعلق سے کچھ اور انکشافات ہوئے۔ بابر کی فتح پور آمد کا مسئلہ بھی زیر قلم آیا۔ فخر التواریخ کا مسودہ بھی مطالعہ میں آیا۔ ان تمام چیزوں کی شمولیت کے بعد مساجد، کنویں اور حویلیوں کی تفصیل بھی شامل کر لی گئی۔ فتح پور کے میلے اور تہواروں کے ساتھ ہی موسم اور فصلوں کی نوعیت اور کیفیت کا احوال بھی شامل کیا گیا، پھر کتاب کا نام بھی تبدیل کر کے 'تاریخ و تذکرہ فتح پور شیخاواٹی' طے پایا۔

بہر حال ہمارے معاشرے اور ہمارے ادب میں ایسا کچھ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہاں کوئی کسی کا

مستقل دوست ہوتا ہے نہ دشمن۔ اس سلسلے میں میرے تجربوں کی طویل فہرست ہے۔ لیکن میں نے ہمیشہ منفی حالات سے نبرد آزمائی کے بعد مثبت راہ نکالی ہے۔ اس کتاب کے لیے بھی یہی ہوا کہ ایک سال کی تاخیر نے اس کی نوعیت ہی تبدیل کردی۔ یہ تذکرہ، شعراء کی محدود اکائی سے نکل کر تاریخ کے وسیع تناظر میں اپنی شناخت بنانے کی حدوں میں آگیا۔

بقول فراز حامدی یہ تذکرہ شیخاواٹی کی تاریخ میں اوّلیت کا حامل ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ اُردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں پانچ سو سال قبل فتح پور شہر کی ابتدا سے لے کر موجودہ زمانہ تک کے احوال موجود ہیں۔

چونکہ اس میں فتح پور کے بنیاد گزار نواب فتح خان چوہان سے آخری نواب قائم خان تک کے مختصر مگر جامع حالات درج ہیں۔ قائم خانی قوم کی وجہ تسمیہ بھی شامل ہے۔ یہ تمام باتیں تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس لیے اس کا نام "تاریخ و تذکرۂ فتح پور شیخاواٹی" رکھا گیا ہے۔

یکم اپریل ۲۰۰۳ء

نذیر فتح پوری

تذکرۂ فتح پور شیخاواٹی

(شیخاواٹی کا پہلا تذکرہ)

ڈاکٹر فراز حامدی

اُردو زبان و ادب میں تذکرہ نگاری کی روایت تقریباً ڈھائی سو سال پرانی ہے۔ میر تقی میرؔ کو اس 'معتبر فن' کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے، جس کے ذہن رسا نے 'تذکرۂ نکات الشعراء' مرتب کیا اور تب سے آج تک 'تذکرۂ نکات الشعراء' کو اُردو کا اوّلین تذکرہ تسلیم کیا جاتا ہے جس کی تصدیق اُردو کے معتبر اور مستند محققین نے بھی کی ہے جن میں حافظ محمود شیرانی، مولوی عبد الحق، قاضی عبد الودود کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

میر تقی میرؔ کا تذکرہ 'نکات الشعراء' اور خواجہ حمید اورنگ آبادی کا 'گلشنِ گفتار' ۱۱۶۵ ہجری میں مرتب ہوا اور ان کے ایک سال بعد یعنی ۱۱۶۶ھ میں سیّد فتح علی گردیزی نے 'تذکرۂ ریختہ گویاں' مرتب کیا اور اس کے دو سال بعد ۱۱۶۸ھ میں قیام الدین قائم چاندپوری اور عنایت اللہ فتوت نے اپنے تذکرے مرتب کیے۔ اُردو کے ان قدیم اور مشہور تذکروں کے بعد تذکروں کی ترتیب و اشاعت کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں آج بھی جاری و ساری ہے۔

'تذکرۂ چمنستانِ شعراء' (لکشمی نرائن شفیق)، 'تذکرۂ شعرائے اُردو' (میر حسن)، 'تذکرۂ گلزارِ ابراہیم' (نواب علی ابراہیم خاں خلیل)، 'تذکرۂ ہندی گویاں' (غلام ہمدانی مصحفی)، 'تذکرۂ گلشن ہند' (میرزا علی لطف)، 'تذکرۂ شورش' یا 'رموز الشعراء' (غلام حسین شورش عظیم آبادی)، 'تذکرۂ بزم شمال' (شاداں فاروقی)، 'تذکرۂ گلشن بے خار' (مصطفیٰ خاں شیفتہ)، 'تذکرۂ انتخاب دواوین' (امام بخش صہبائی)، 'تذکرۂ انتخاب یادگار' (امیر مینائی)، 'تذکرۂ تحفۃ الشعراء' (افضل بیگ)، 'مجموعۂ نغز' (قدرت اللہ قاسم)، 'تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا' (سعادت خاں ناصر)، 'آفتابِ عالم تاب' (محمد صادق اختر)، 'تذکرۂ شاعراں' (محسن علی محسن)، 'گلستانِ سخن' (مرزا قادر بخش صابری)، 'سخن شعراء' (عبد الغفار نساخ)، 'خزینۂ سخن' (مصور سبزواری)، 'تذکرۂ شعرائے ہنود' (جوہر دیوبندی) وغیرہ کی ترتیب و اشاعت بھی تذکرہ نگاری کی تاریخ میں بطور اضافہ ہے۔

اُردو تذکرہ نگاری کی ابتداء اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہوئی تب سے آج تک تذکرہ نگاری کا چلن عام رہا ہے اور ہزاروں تذکرے معرضِ وجود میں آچکے ہیں جن کی بدولت ہم عہدِ ماضی کے قلمکاروں کے فن اور شخصیت سے واقف ہوسکتے ہیں اور اپنے خیالات کا اظہار بھی کرسکتے ہیں۔

مرتب کردہ تذکرے عام طور پر شعراء کے حالات اور ان کے کلام کے نمونوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بیشتر تذکرے مقامی شعراء سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ تذکرے اپنے عہد کے تقریباً سبھی شعراء کا احاطہ کیے ہوتے ہیں لیکن ایسے تذکروں کی تعداد بہت کم ہے۔

'تذکرہ نگاری' کو تاریخ میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح تحقیق سے بھی اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے لیکن تذکرہ نگاری تاریخ اور تحقیق سے ہٹ کر ایک 'معتبر فن' ضرور ہے، جس کی اہمیت، افادیت اور انفرادیت ہر دَور میں مسلّم رہی ہے اور مستقبل میں بھی رہے گی۔ تذکرہ نگاری اپنے مواد اور ہیئت کے اعتبار سے ایک مکمل فن ہے۔ سنجیدگی، توازن اور دیانتداری کا فن ہے۔ لاریب یہ تذکرے اپنے عہد کے ترجمان ہوتے ہیں۔ مختصر تاریخ ہوتے ہیں، تحقیق ہوتے ہیں اور ان کے حوالے اسناد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اُردو زبان و ادب میں تاریخ لکھنے کا رواج بعد میں ہوا۔ محمد حسین آزاد کی مرتب کردہ کتاب 'آبِ حیات' کو خاصی اہمیت حاصل ہے لیکن یہ کتاب مکمل تاریخ نہیں ہے بلکہ تاریخ اور تذکرے کی درمیانی کڑی ہے۔ اُردو میں معتبر ادبی تاریخیں برائے نام ہیں۔ مولوی عبدالحی کی 'گلِ رعنا'، رام بابو سکسینہ اور محمد عسکری کی 'تاریخ ادب اُردو'، عبدالسلام ندوی کی 'شعر الہند'، 'لالہ سری رام کی 'خُمخانہ جاوید'، ڈاکٹر جمیل جالبی کی 'تاریخ ادبِ اُردو' کا شمار معتبر ادبی تاریخوں میں کیا جاسکتا ہے۔

علاوہ ازیں اُردو میں کچھ مختصر ادبی تاریخیں بھی لکھی گئی ہیں جن میں ڈاکٹر اعجاز حسین کی 'مختصر تاریخ ادب اُردو'، پروفیسر احتشام حسین کی 'اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ'، ڈاکٹر سلیم اختر کی 'اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'، انور سدید کی 'اُردو ادب کی مختصر تاریخ' کو اُردو کی مختصر ادبی تاریخوں میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

اُردو زبان و ادب میں خواتین سے متعلق تذکروں کی تعداد بھی خاصی ہے جو وقتاً فوقتاً مرتب ہوتے رہے ہیں اور اشاعت پذیر بھی۔ ان میں سے کچھ معتبر اور معروف تذکروں کا ذکر ذیل میں درج ہے:

۱...... 'بہارستانِ ناز' :اس تذکرہ کے مرتب حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی ہیں اور اس کا سنہ اشاعت ۱۸۶۴ء ہے۔ یہ تذکرہ ۱۷۴ شاعرات کے حالاتِ زندگی اور کلام کے نمونوں پر مشتمل ہے۔

ساتھ ہی اس دور کی طوائفوں کا ذکر بھی بڑے ادب و احترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔

۲...... 'شمیم سخن' - یہ تذکرہ ۱۵۱؍ شاعرات پر مشتمل ہے۔ مرتب عبد الحی صفا بدایونی ہیں اور سن اشاعت ۱۸۸۱ء۔

۳...... 'مشاہیر نسواں' یہ تذکرہ بھارت، ایران، عرب اور یورپ کی مشہور خواتین کے مختلف طبقوں کے حالات اور کمالات پر مشتمل ہے۔ اس کا سنِ اشاعت ۱۹۰۲ء ہے اور مرتب مولوی محمد عباس لاہوری ہیں۔

۴...... 'حیدر آباد کی نسوانی دنیا' - یہ تذکرہ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا ہے۔ مرتب مولوی نصیر الدین ہاشمی نے ۲۳؍ شاعرات کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام کے نمونوں کو اس تذکرہ میں شامل کیا ہے۔

۵...... 'تذکرۂ نسواں' - یہ تذکرہ ۵۰۰؍ شاعرات کے حالات اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے۔ تذکرے کے مرتب مولوی فصیح الدین بلخی نے اسے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا۔

۶...... 'تذکرۂ جمیل' کے مرتب عبد الرزاق بسمل ہیں اور 'تذکرہ شاعرات جھارکھنڈ' کے مرتب ڈاکٹر شاداب رضی بدایونی ہیں۔

راجستھان میں بھی تذکرہ نگاری کا چلن پرانا ہے لیکن اتنا پرانا بھی نہیں کہ اس صوبے کو دوسرے صوبوں پر افضلیت حاصل ہو۔ یہاں پہلا تذکرہ ۱۹۰۱ء عیسوی میں معرضِ وجود میں آیا جس کی اہمیت اور افادیت آج بھی برقرار ہے۔

راجستھان میں 'ٹونک' کو علم و ادب کا قدیم اور معتبر و مستند گہوارہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہاں کے نوابین اور روساء بھی علم دوست اور صاحب کمالات رہے ہیں۔ شعر گوئی ان کی فطرت میں شامل تھی اور قلمکاروں کی سرپرستی کرنا اور انھیں سرفرازیاں عطا کرنا ان کی علمی و ادبی دوستی کا نمایاں حصہ رہی ہے۔

تذکرہ نگاری کے باب میں 'ٹونک اسٹیٹ' کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ ۱۹۰۱ء میں یہاں کے نمائندہ شاعر اور شاعر گر فردوسئ ہند سیّد اصغر علی آبروؔ نے 'حدیقۂ اُردو' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جو ریاست ٹونک کے نوابین کے حالات اور کمالات پر مشتمل ہے۔ ویسے تو اس کتاب کو ریاست ٹونک کی تاریخ کہا جاتا ہے لیکن اس کتاب کا ایک حصہ بہ عنوان 'بزم خلیل' شعر و سخن پر مشتمل ہے۔ بزم خلیل میں ایک طرحی مشاعرے کا ذکر کیا گیا ہے جو صاحبزادہ شیر علی خاں شررؔ (مرحوم) کے دولت کدہ پر منعقد ہوا تھا۔ اس طرحی مشاعرے میں جن شعراء کرام نے شرکت کی تھی، ان کے مختصر حالات اور طرحی غزلیں شامل اشاعت ہیں جس کے سبب 'حدیقۂ اُردو' کو راجستھان کا اوّلین تذکرہ تسلیم کیا جاتا

ہے۔ ویسے اُستاد آبرو کی مرتب کردہ اس کتاب کو محمد حسین آزاد کی تالیف 'آبِ حیات' کی مانند تاریخ اور تذکرے کی درمیانی کڑی کہا جاسکتا ہے۔ ویسے بھی تذکرہ نگاری کے باب میں 'حدیقۂ اُردو' سے پہلے راجستھان کی کسی بھی ادبی بستی میں ایسی کتاب، کتابچہ یا تحریر محققین کے سامنے نہیں آئی جسے راجستھان کا اوّلین تذکرہ کہا جاسکے۔ لہٰذا بالاتفاق رائے 'حدیقۂ اُردو' کو ہی راجستھان کا پہلا ادبی تذکرہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

'حدیقۂ اُردو' کے بعد راجستھان میں تذکرہ نگاری کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ جبکہ یہاں ہر دَور اور ہر زمانے میں قلمکاروں کی خاصی تعداد رہی ہے۔ اس تذکرہ کی اشاعت کے ایک طویل مدت بعد جے پور کے معروف قلمکار ڈپٹی احترام الدین احمد شاغلؔ نے 'تذکرہ شعرائے جے پور' مرتب کیا جس کا شمار مکمل تذکروں میں کیا جاتا ہے۔ اس تذکرہ میں جے پور کے متعدد شعراء کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام کے نمونوں کے علاوہ شاغلؔ صاحب نے اُن شعراء کو بھی اس تذکرہ میں شامل کیا ہے جن کا تعلق جے پور سے صرف اتنا ہی تھا کہ وہ جے پور میں قیام پذیر تھے۔ اس کتاب میں قدیم و جدید شعراء کے تذکروں کے ساتھ ساتھ اُس دَور کے اُردو پریس، اخبار، رسائل و جرائد اور ادبی انجمنوں کی تفصیل بھی درج ہے۔ لاریب یہ تذکرہ مرحوم شاغلؔ صاحب کا ایک نمایاں کارنامہ ہے جس کے لیے نہ صرف جے پور بلکہ راجستھان کا اُردو سماج ان کا ممنون و مشکور ہے اور رہے گا۔

۱۹۶۷ء میں ایک اور تذکرہ 'دامانِ باغباں' زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا جس میں محکمۂ تعلیمات راجستھان سے وابستہ گیارہ شعراء کے حالاتِ زندگی اور کلام کے نمونے شامل اشاعت ہیں۔ اس تذکرے کے مرتبین میں انل بوردیا (سابق ڈائرکٹر تعلیمات، بیکانیر)، ایس کمار (سابق ڈپٹی ڈائرکٹر سوشل ایجوکیشن راجستھان بیکانیر)، ڈاکٹر کامیشور دیال حزیںؔ (سابق پرنسپل ساردول اسکول بیکانیر)، عارف نقشبندی بیکانیر جیسے نامور اور اُردو زبان و ادب نواز حضرات کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اس تذکرہ کی اشاعت نیشنل اکادمی دہلی میں ہوئی اور یہ تذکرہ آج بھی مقبول و مشہور اور نمائندہ تذکروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ تذکرہ ہندوستان کے بیشتر کتب خانوں میں آج بھی موجود ہے۔

ماہِ اکتوبر ۱۹۹۳ء میں 'تذکرۂ شعرائے ٹونک' اشاعت پذیر ہوا۔ یہ تذکرہ بہت ہی مختصر تذکرہ ہے جس میں صرف سو شعراء کے حالات اور کلام کے نمونے شامل اشاعت ہیں۔ اس تذکرہ کے مرتب ٹونک کے معروف قلمکار صاحبزادہ امداد علی خاں شمیمؔ ہیں جنھوں نے سینکڑوں قدیم و جدید شعرائے ٹونک میں سے اپنی بساط کے مطابق صرف سو شعراء کو ہی تذکرے میں شامل کیا۔ یقیناً شمیمؔ صاحب کا یہ کارنامہ

لائق ستائش ہے۔ جس کے لیے موصوف مبارکباد کے مستحق ہیں۔

سرزمین ٹونک کے ایک ہندی قلمکار ہنومان سنگھل نے دو ادبی تذکروں کو مرتب کر کے اُردو زبان و ادب سے اپنی شیفتگی اور فریفتگی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ موصوف کا پہلا تذکرہ 'انجمن' ۶۷ر شعراء کے حالات اور کلام کے نمونوں پر مشتمل ہے اور اس تذکرہ کا سن اشاعت ۱۹۹۵ء ہے۔ موصوف کا دوسرا تذکرہ 'کارواں' ہے جس میں ۳۳ر شعراء کے حالات اور ان کا کلام شامل اشاعت ہے۔ اس تذکرہ کا سن اشاعت ۲۰۰۰ء ہے۔ یہ دونوں تذکرے 'دیوناگری' میں شائع کیے گئے ہیں۔ سنگھل صاحب کے ان دونوں تذکروں کی ترتیب و اشاعت راجستھان کی اُردو تذکرہ نگاری کی تاریخ میں سنگھل صاحب کو ایک امتیازی حیثیت عطا کرتی ہے۔

'بیکانیر میں اُردو کے علمبردار' کے مرتب الحاج خورشید احمد صاحب ہیں۔ یہ تذکرہ بیکانیر کے قدیم و جدید اُنیس شعراء کے حالات اور ان کے کلام پر مشتمل ہے جسے 'حلقۂ ادب بیکانیر' نے ۲۰۰۱ء میں شائع کیا۔ ادبی تذکرہ نگاری کے باب میں لاریب الحاج خورشید احمد صاحب کا یہ تاریخی کارنامہ قابل قدر بھی ہے اور لائق ستائش بھی۔

راجستھان ایک بڑا صوبہ ہے اور یہاں ہر دَور میں اُردو قلمکاروں کی تعداد خاصی رہی ہے۔ ان میں سے کچھ قلمکار مشہور و معروف بھی رہے اور کچھ قلمکار مذکورہ بالا ادبی تذکروں میں شامل اشاعت ہو سکے لیکن بیشتر قلمکار گمنامی کے گہرے غار میں مرکھپ گئے۔ دَورِ حاضر میں بھی اُردو قلمکاروں کی خاصی تعداد اُردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود نہ تو یہاں مکمل تاریخ مرتب کی گئی نہ مختصر تاریخ لکھنے کے لیے کسی سرکاری، نیم سرکاری یا غیر سرکاری ادارے نے پہل کی۔ حد تو یہ ہے کہ ادبی تذکرہ نگاری کا چلن بھی عام نہ ہو سکا جس کے سبب ماضی کے قلمکاروں کے فن اور شخصیت پر کچھ سوچ وچار کرنا یا کچھ لکھنا ممکن نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ صوبہ راجستھان کے شعری و نثری سرمایہ پر دیمک کا قبضہ ہوتا جا رہا ہے۔

متذکرہ بالا ادبی تذکروں کی اشاعت کے سبب راجستھان میں تذکرہ نگاری کے فن کو پنپنے کیلئے خوشگوار فضا تیار ہوئی ہے جس کے پیش نظر 'راجستھان اُردو اکادمی جے پور' نے بھی کچھ ادبی تذکرے شائع کیے ہیں۔ ان میں سے 'تذکرہ شعرائے اجمیر' ایک جامع اور مکمل تذکرہ ہے لیکن جودھپور اور کوٹہ کے ادبی تذکروں میں کچھ اور لوگوں کے ساتھ راقم الحروف اور کیف بھوپالی کی ادبی خدمات کو نظر انداز کیا ہے جبکہ ان دونوں شہروں میں نئی شاعری کے بنیاد گزاروں میں راقم الحروف اور کیف بھوپالی مرحوم

کے نام سر فہرست رہے ہیں۔ دراصل تذکرہ نگاری ایک ذمہ داری اور ایمانداری کا فن ہے۔ ذاتی رنجش اور مخاصمت اس فن کیلئے مہلک ثابت ہوتے ہیں اور تذکرے کو داغدار بنا رہے ہیں۔

ٹونک اور جے پور بھی راجستھان اُردو اکادمی کی حدود میں شامل ہیں لیکن ان دونوں شہروں کو لگاتار نظرانداز کیا گیا ہے۔ اور اسی لاپرواہی کے شکار ناگور اور شیخاواٹی کے علاقے بھی ہیں۔ جنھیں ہر لحاظ سے تاریخی حیثیت حاصل ہے۔

راجستھان میں زبان و ادب کے معماروں نے شیخاواٹی کو پسماندہ سمجھتے ہوئے ہمیشہ نظرانداز کیا ہے حالانکہ شیخاواٹی کا ماضی بھی شاندار رہا ہے اور حال بھی اور اس کا مستقبل بھی تابناک ہے۔ خصوصی طور پر دلیر اور بہادر نوابوں کی بستی 'فتح پور شیخاواٹی' کو ہر لحاظ سے تاریخی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اُردو اور فارسی کا یہاں بول بالا رہا ہے اور آج بھی اُردو و فارسی کی متعدد شعری و نثری کتابیں یہاں کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ 'فتح پور شیخاواٹی' کی ادبی حیثیت اس لیے بھی مسلّم ہے کہ 'نذیر فتح پوری' جیسا نامور اور قد آور کثیر الجہات تخلیق کار کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔

مغل بادشاہوں کے زیرِ اثر اس قصبے کے نوابین، روساء اور شرفاء کی زبان فارسی رہی ہے اور یہاں کے سبھی نوابین سلاطین مغلیہ سے وابستہ رہے ہیں اور انھیں وقتاً فوقتاً مغلیہ دربار سے نوازا جاتا رہا ہے۔ فتح پور شیخاواٹی کے پانچویں نواب دیوان فدن خاں کی بیٹی 'تاج بی بی' کی شادی سمراٹ اکبر سے ہوئی تھی۔ 'تاج بی بی' کو شعر و ادب سے گہرا لگاؤ تھا اور ان کا تخلیقی رجحان طنز و مزاح کی جانب تھا، لہٰذا طنز و مزاح سے بھرپور ان کی ایک کتاب 'بی بی باندی کا جھگڑا' فتح پور کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

'تاج بی بی' کو دوہا نگاری میں بھی یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ ان کے دوہوں کی خوشبو نہ صرف شیخاواٹی میں بلکہ دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ بطور تمثیل ان کا ایک مشہور دوہا پیشِ خدمت ہے۔

کاگا سب تن کھائیو چن چن کھائیو مانس
دو نیناں مت کھائیو پیا دیکھن کی آس

مذکورہ بالا دوہا ایک عرصۂ دراز تک بابا فریدؒ کے نام سے منسوب رہا ہے لیکن ڈاکٹر اودے شنکر سریواستو کی تحقیق کے مطابق اس دوہے کی تخلیق کار 'تاج بی بی' ہی ہیں۔

'فتح پور' تھار کے ریگستان میں آباد ہے۔ اس ریگستانی خطے کو نخلستان میں تبدیل کرنے والا پہلا نام نواب فتح خاں ہے جس نے ۱۴۵۱ء صدی میں اس قصبے کی بنیاد رکھی اور اسے 'فتح پور' نام دیا۔ چونکہ فتحپور راجستھان کے شیخاواٹی علاقے میں آباد ہے۔ اس لیے فتح پور کے ساتھ شیخاواٹی لگایا جاتا ہے۔ نذیر

احمد المعروف نذیر فتح پوری کا وطن بھی یہی تاریخی قصبہ ہے جسے نذیر صاحب کے شعری و نثری اور صحافتی نمایاں کارناموں کے سبب عالمگیر شہرت حاصل ہے۔ نذیؔر فتح پوری ایک عرصہ دراز سے پونا میں قیام پذیر ہیں اور سہ ماہی 'اسباق' کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے باقاعدگی کے ساتھ اس کی ترتیب و اشاعت میں مصروف ہیں۔ علاوہ ازیں نذیؔر صاحب تقریباً پچیس کتابوں کے مؤلف و مصنف ہیں اور ہندوستان کے تیز رفتار تخلیق کاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی شعری و نثری تخلیقات انڈو پاک اور بیرونی ممالک کے رسائل و جرائد میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتی رہتی ہیں۔ نذیؔر کتابوں، رسالوں اور مشاعروں کی دنیا کے علاوہ 'انٹرنیٹ' پر بھی اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔

تذکرہ نگاری کی اہمیت اور افادیت ہر دَور میں مسلّم رہی ہے جس کے پیشِ نظر نذیؔر فتح پوری نے 'تاریخ و تذکرۂ فتح پور شیخاواٹی' کی ترتیب و اشاعت کا کام مکمل کیا ہے اور اس تاریخی کام کی غرض سے نذیؔر صاحب نے گذشتہ چند سالوں میں پونا سے فتح پور کے کئی سفر بھی کیے ہیں۔ یہاں کے کتب خانے کھنگالے ہیں اور پرانے لوگوں کی یادداشت سے کچھ کام کی باتیں حاصل کی ہیں۔

ویسے تو راقم الحروف کا وطن ٹونک ہے اور وطنِ ثانی جے پور لیکن سارے راجستھان میں ہی آمد و رفت کے مواقع فراہم ہوتے رہے۔ بیشتر علاقوں کے ادبی اور سماجی حلقوں سے بخوبی واقف ہوں اور ان علاقوں سے گہری وابستگی رہی ہے۔ اسی طرح علاقۂ شیخاواٹی سے بھی میری پہچان پرانی ہے۔ کچھ سالوں سے 'شیخاواٹی' فیسٹیول کے اراکین میں شامل ہوں اور اس فیسٹیول کا کبھی کبھی ایک دن سہ لسانی کل ہند مشاعرے کیلئے بھی وقف کیا جاتا ہے جس کی ساری ذمہ داری میرے کمزور کاندھوں پر ہوتی ہے، لہٰذا چورو، جھونجھنوں اور ضلع سیکر کے راجستھانی، ہندی اور اُردو کے قلمکاروں کی صلاحیتوں سے خاصہ واقف ہوں اور ان سے قریب ہوں۔ اسی آمد و رفت کے دوران کچھ ملاقاتیں نذیؔر صاحب سے بھی ہوتی رہی ہیں۔ جن میں تذکرہ کی ترتیب میں آنے والی اُلجھنوں اور دشواریوں کا ذکر بھی رہا ہے۔

نذیؔر فتح پوری کے مرتب کردہ "تاریخ و تذکرۂ فتح پور شیخاواٹی" کے مسودے کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اس تذکرے سے پہلے فتح پور شیخاواٹی سے متعلق اور کوئی تذکرہ معرضِ وجود میں نہیں ہے۔ لہٰذا اس تذکرے کو اوّلین تذکرہ کہا جاسکتا ہے۔

گذشتہ ہفتے ڈاک سے جب مجھے تذکرہ کا مسودہ موصول ہوا تو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ نذیؔر صاحب کی برسوں کی محنت کامیابی کی صورت میں میرے سامنے ہے اور مجھے اس پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا ہے۔ نذیؔر صاحب کی یہ خواہش میرے لیے قابلِ احترام بھی ہے اور قابلِ قدر بھی۔

تذکرہ نگار نے بڑی محنت، جاں فشانی، خلوص اور لگن کے ساتھ اس تذکرے کو مرتب کیا ہے۔

یہ تذکرہ فتح پور شیخاواٹی کے ۴۰۸ر شعراء پر مشتمل ہے۔ شعراء کی اس تعداد میں مرحومین اور موجودہ شعراء دونوں ہی شامل ہیں یعنی مرحوم حاجی نجم الدین نجم 'آفتاب شیخاواٹی' سے لے کر مرحوم حاجی یٰسین تک مرحوم شعراء اور پیر محمد عارف نجمی سے لے کر ادریس چنوری تک موجودہ شعراء کے حالات و کوائف اور ان کی شعری تخلیقات اس تذکرے میں شامل ہیں۔

تذکرہ کی زبان و بیان سادہ اور سلیس ہے۔ چونکہ تذکرہ نگار ناول اور افسانہ نگار بھی ہیں اس لیے تذکرہ کی عبارت میں جا بجا افسانوی جھلکیوں نے اسے اور بھی دلکش اور موثر بنادیا ہے۔

تذکرۂ فتح پور شیخاواٹی ایک مکمل تذکرہ ہے اور یہ تذکرہ فتح پور شیخاواٹی کی شعری ادوار کا مکمل احاطہ کیے ہوئے ہے۔ تذکرہ نگار نے اس تذکرے میں شامل قدیم و جدید شعراء کی شخصیت اور فنی صلاحیتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اور ان کے حالات تحریر کرتے وقت نہایت خلوص، محبت اور سنجیدگی سے کام لیا ہے اور قدم قدم پر اپنی ادبی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا ہے۔ جیسے جیسے مرتب کا قلم آگے بڑھتا ہے ویسے ویسے اس کی خداداد صلاحیتیں اُجاگر ہوتی گئی ہیں۔

'فتح پور' چونکہ شیخاواٹی علاقے میں آباد ہے اور یہاں کی علاقائی زبان راجستھانی ہے، اس کے باوجود اُردو یہاں کی بول چال کی زبان رہی ہے اور اس زبان میں وقتاً فوقتاً علمی و ادبی کام بھی ہوتا رہا ہے اور شعر و سخن کا چرچہ تو یہاں کے پڑھے لکھے طبقے میں ہمیشہ رہا ہے۔ تذکرہ میں شامل کچھ قدیم شعراء نے اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان میں بھی مشق سخن کی ہے۔ اس کا خلاصہ بھی تذکرے میں شامل ہے۔

ماضی کے شعراء کے شعری کارناموں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کیلئے تذکرہ نگار نے تحقیق و تلاش کے ساتھ ساتھ اپنی ذہانت اور علمی و ادبی سوجھ بوجھ سے بھی کام لیا ہے۔ ویسے بھی عہد ماضی کے شعراء کے حالات و کوائف رقم کرنے کیلئے مرتب کو ایمانداری، ذمہ داری، اعتماد اور یقین جیسے انمول شبدوں کی اہمیت کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ زیر نظر تذکرے کے مطالعے کے بعد راقم الحروف کو یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں ہے کہ مرتب کے ادبی کردار نے اس کام کو بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔

علاوہ ازیں فاضل تذکرہ نگار نے تذکرے کی ابتدا اپنی ایک نظم بعنوان 'ایک نظم فتح پور کے نام' سے کی ہے اور موصوف کا یہ شعری اظہار یقیناً اپنے وطن سے بے پناہ محبتوں اور چاہتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے صرف قدیم و جدید شعراء کے حالات اور کسب کمالات تک ہی اس تذکرے کو محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں فتح پور کے نوابین کے حالات اور کمالات بھی درج کیے ہیں جن

پر مرتب کو ہر لحاظ سے فخر حاصل ہے۔ یہ حالات تاریخ کے روشن باب ہیں۔

جیسا کہ راقم الحروف پہلے بھی عرض کر چکا ہے کہ فتح پور شیخاواٹی کی علاقائی زبان راجستھانی ہے اور راجستھانی کے تخلیق کاروں کو ہر دور میں نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ فتح پور کے 'جان کوی نعمت خاں' بھی راجستھانی زبان و ادب کے نہایت معتبر اور مستند تخلیق کاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مرحوم ایک زود گو اور قادر الکلام شاعر تھے اور پچھتر شعری کتابوں کے مصنف تھے جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں اور آج بھی بیکانیر کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ زیر نظر تذکرہ میں 'جان کوی نعمت خاں' سے متعلق تین ابواب شامل ہیں۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ مرتب نے 'جان کوی' کی مشہور شعری تصنیف 'راسا' میں شامل فارسی اور اُردو الفاظ چن کر ایک فہرست مرتب کی ہے جو اس تذکرہ میں شامل ہے۔ اُردو تذکرہ میں راجستھانی کے تخلیق کار 'جان کوی' کو شامل کرنا اور تین ابواب میں ان کے فن اور شخصیت پر سیر حاصل تبصرہ کرنا یقیناً فاضل تذکرہ نگار کی وسیع النظری اور وسیع القلبی کا مظہر ہے۔ وہ چاہتے تو 'جان کوی' کو نظرانداز بھی کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اسے اپنی ضرورت سمجھتے ہوئے اپنے تذکرہ میں نمایاں حیثیت عطا کی۔ تذکرہ نگار خود بھی ایک قد آور شعری و ادبی شخصیت کا مالک ہے۔ موصوف کے فن اور شخصیت پر کم و بیش پندرہ سو صفحات لکھے جا چکے ہیں جو انڈو پاک کے موقر رسائل و جرائد میں اور نثری کتابوں میں شائع ہو کر شائقین ادب سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تذکرہ نگار ہندوستان کے اُن گنے چنے تخلیق کاروں میں شمار کیا جاتا ہے جنھیں ہر لحاظ سے عالمی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے تذکرے میں راجستھانی زبان و ادب سے اپنی گہری وابستگی کا اظہار کیا اور 'فخر راجستھان جان کوی' کے نمایاں اور تاریخی کارناموں کو اُردو جگت کے سامنے پیش کرتے ہوئے نہ صرف اپنے وطن فتح پور بلکہ پورے شیخاواٹی علاقے کو انفرادی حیثیت عطا کی اور اسے سرفرازیاں بخشیں۔

زیر نظر تذکرے میں 'سمراٹ اکبر کی بیگم تاج بی بی' کی تفصیل بھی درج کی گئی ہے اور بیگم صاحبہ کی ادبی حیثیت کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ فتح پور میں نوابی دور کے زوال پذیر ہونے کے بعد یہاں شیخاوت راجپوتوں کے حکمرانوں کا بول بالا رہا۔ تذکرہ نگار نے ان کے حالات اور کمالات کو بڑے خوبصورت انداز میں واضح کرتے ہوئے اپنے تذکرے کو معتبر اور مؤثر بنا دیا ہے۔

شیخاواٹی علاقے میں پہلی تصنیف کا خالق کون ہے؟ اور عارف فتح پوری کے عید گاہ سے متعلق استقبالیہ نغمے کی انفرادی حیثیت کیا ہے؟ ان دونوں باتوں کا تعلق یقیناً تحقیق و تلاش سے ہے، لہٰذا ان

موضوعات پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ فاضل تذکرہ نگار نے ادبی رنجش اور مخاصمت سے قطعاً کام نہ لیتے ہوئے اپنی ادبی ایمانداری اور دیانتداری کا ثبوت دیا ہے۔

فتح پور شیخاواٹی میں مسجدوں، حویلیوں اور کنوؤں کی تعداد خاصی ہے۔ اِن حویلیوں اور کنوؤں کی تفصیل بھی تذکرے میں شامل کرنا تذکرہ نگار نے ضروری سمجھا ہے۔ اسی طرح سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری علمی و ادبی اداروں کی تفصیل تذکرے کو تاریخی حیثیت عطا کرتی ہے۔

الغرض تذکرۂ فتح پور شیخاواٹی تاریخی اور تحقیقی اعتبار سے ایک مکمل تذکرہ ہے۔ ویسے بھی کوئی تذکرہ تاریخ اور تحقیق کے بغیر مکمل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' اور اُستاد آبرو ٹونکی کی 'حدیقۂ اُردو' یہ دونوں کتابیں تاریخ کے موضوع پر لکھی گئی ہیں لیکن اہلِ ذوق کی نظر میں ان کا شمار مکمل یا نامکمل تذکروں میں بھی ہوتا ہے یا پھر ان دونوں کتابوں کو تاریخ اور تذکرے کی درمیانی کڑی سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح پروفیسر ڈاکٹر عبد المنان طرزیؔ کا 'منظوم تذکرہ رفتگاں و قائماں' دربھنگہ کی منظوم تاریخ بھی ہے اور دربھنگہ سے تعلق رکھنے والے تقریباً ۵۳۴ تخلیق کاروں کے حالات و کوائف پر مشتمل ایک مکمل تذکرہ بھی ہے اور ان ۵۳۴ ر تخلیق کاروں میں شاعر، ادیب، افسانہ نگار، نقاد اور اُردو، فارسی و عربی کے مؤلفین اور مصنفین شامل ہیں۔ واضح رہے کہ اُردو تذکرہ نگاری کی تاریخ میں پروفیسر طرزیؔ کے منظوم تذکرہ کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔

مزید تفصیلات سے قطع نظر فاضل تذکرہ نگار کا یہ ادبی تذکرہ فتح پور شیخاواٹی کا مکمل تاریخی و تحقیقی تذکرے کی تعریف میں آتا ہے۔ علاوہ ازیں یہاں کے قدیم و جدید شعراء کے خاندانی پس منظر، تعلیم و تربیت، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام اور تالیفات و تصنیفات سے متعلق ضروری معلومات یکجا کر کے تذکرہ نگار نے ایک نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ لاریب موصوف کی اس بے لوث ادبی خدمت کو تاریخی اور ادبی دستاویز کی حیثیت حاصل ہوگی جس سے نہ صرف موجودہ بلکہ آنے والی نسلیں بھی استفادہ کریں گی اور یہ ادبی تذکرہ مشعلِ راہ ثابت ہوگا اور فنِ تذکرہ نگاری کی تاریخ میں بطور اضافہ شمار کیا جائے گا۔

اخیر میں راقم الحروف فاضل تذکرہ نگار کی ادبی صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے اپنی ایک دوہا دوبیتی (نئی شعری صنف) یہاں درج کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

تم ہو سچ مچ ماہیا، گیت، غزل کی شان ‌ ‌ قصرِ ادب کی سیڑھیاں چڑھتے رہو نذیرؔ

ڈھونڈھے سے اسباق کی ملتی نہیں نظیر ‌ ‌ رہتے ہو جی جان سے اُردو پر قربان

❁❁❁

امانی شاہ روڈ، شاستری نگر، جے پور ۱۶

نذیر فتح پوری...... میری آنکھ کا آنسو

احمد علی خان منصور چوڑوی

فتح پور شیخاواٹی میرے لیے ایک زیارت گاہ سے کم نہیں ہے۔ اس کی زیارت سے میرے عقید تمندانہ جذبات کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ میرے حوصلوں میں اضافہ ہوتا ہے، مجھے روحانی سکون ملتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں؛ پہلی وجہ یہ ہے کہ ۱۴۴۶ء میں اس شہر کی بنیاد رکھنے والے فتح خان میرے اجداد میں سے تھے۔ فتح پور کی تاریخ میرے اجداد کے ایثار، ان کی قومی و ملّی خدمات، ان کی گنگا جمنی تہذیب، ان کے حسنِ انتظام نیز خدمتِ عوام کی ہزاروں داستانیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان میں کئی نواب ولایت کے اعلیٰ مرتبوں کے حامل رہے ہیں اور کئی اپنے وقت کے بلند پایہ شاعر، ادیب اور قلمکار رہے ہیں۔ نواب درِ دولت خان کا مزار آج بھی زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ نواب نعمت خان (کوی جان) ڈنگل، سنسکرت و فارسی کے عظیم المرتبت شاعر و ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی ساٹھ سے زیادہ مطبوعات جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں، راجستھان کے مختلف شاہی کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ تین صدیوں پر محیط ان نوابوں کا دَورِ حکومت اپنے نظم و نسق، اپنی انصاف پسندی، اپنے امن و امان کے لیے مشہور رہے۔

دوسری وجہ ہے درگاہ حاجی نجم الدین علیہ الرحمۃ جس کی روحانی فضائیں حسنات و برکات کا وہ سرچشمہ ہے جس سے انسانیت کی فصل مسلسل سرسبز و شاداب رہی نیز پھلتی، پھولتی اور پروان چڑھتی رہی ہے۔ ان کے علاوہ باشندگانِ فتح پور کی محبتیں، ان کا خلوص و رواداری، ان کی تمیز و تہذیب اور خصوصاً فنونِ لطیفہ سے ان کی رغبت اور لگاؤ، ان کی حسیّت و تفہیمی صلاحیت نے بھی مجھے گرویدہ بنا رکھا ہے۔ پھر نذیر فتح پوری کا مولد و مسکن بھی تو یہی فتح پور ہے۔ نذیر ۳۲ویں پیڑھی میں میرا بھائی ہے۔ شاکمبھری چوہان میں راجہ گھنگھ بڑا نامور راجہ ہوا ہے جو ۳۵/ویں پیڑھی میں ہمارا دادا تھا۔ نذیر اور میرے اجداد نے ۸۰۰ سال تک موجودہ شیخاواٹی کے ساتھ ساتھ چورو ناگور ضلعوں کے خطۂ بسیط پر حکومت کی ہے۔

بہر حال نذیر میرا دوست ہے، میرا دشمن ہے یا میرا بھائی ہے یا ان میں کون سا رشتہ کتنا ایماندار ہے یہ تو میں نہیں کہہ سکتا، ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ میرا ہے اور شاید میرے اپنے کی حد تک میرا ہے۔

نذیر میری آنکھ کا آنسو ہے، میری روح کا کرب ہے۔

نذیر جانتا ہے کہ میں لکھنے سے بہت کتراتا ہوں، لکھنا میرے لیے عذاب جیسا ہے، اس کا اصرار ہے کہ میں اس کے لیے کچھ لکھوں، جب لکھوں تو سب سے پہلے وہ لکھوں جو لکھنا نہیں چاہیے۔ نذیر کی نذر کرتا ہوں یہ چند اشعار ؎

بازاریت پسند مقالوں میں پھنس گیا
اک بے مثال شخص مثالوں میں پھنس گیا

یہ کیا ہوا نذیر حوالوں میں پھنس گیا
گھر آتے آتے کتنے سوالوں میں پھنس گیا

کل تک بفیضِ اشک جو روشن ضمیر تھا
وہ کیوں گناہ گیر اُجالوں میں پھنس گیا

دلبستگی کو آبلہ و خار کم نہ تھے
صحرا نورد کیسے غزالوں میں پھنس گیا

کیوں کر بساطِ غیرتِ اِحساس کا وزیر
اوباشئ خیال کی چالوں میں پھنس گیا

بکنا جناب یوسفِ کنعاں کا بھول کر
یہ کن ادا فروش دلالوں میں پھنس گیا

جانا بہ اوجِ دار تھا منصور کو نذیر
لے وہ بھی تیرے چاہنے والوں میں پھنس گیا

لکھنے چلا ہوں اور خوف لاحق ہے کہ ترسیل کی بہ معرفت اسے کہیں ان لوگوں کے درمیان نہ لے جائے جو حرفوں کے بنے ہیں۔ انگریزی کا لفظ Man of Letters اپنی جگہ لائق صد احترام ہے لیکن یہ حرفوں کے بنے لوگ کئی بار حرّافی کی حد تک جا پہنچتے ہیں۔ شعر کہنے تک کی بات تو ان کے نزدیک قابلِ تلافی و معافی ہو سکتی ہے لیکن شعر و شاعری کے بارے میں کچھ اظہارِ خیال کو یہ جسارتِ بیجا سے تعبیر کرتے ہیں اور ناقابلِ تلافی گناہ گردانتے ہیں۔ ان کتابی کیڑوں کو الفاظ کی جوڑ جگت میں بڑی مہارت ہوتی ہے، البتہ ان کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ ہوتا کتابوں ہی کا ہے۔ اقتباسات اور حوالوں کی بوچھار لگا کر یہ افسانے کو حقیقت اور حقیقت کو افسانے میں بدل سکتے ہیں۔ پیوند کاری میں مشاق ہوتے ہیں، شاعری اور ادب کیا ہے۔ یہ بھی انھوں نے کتابوں ہی میں پڑھا ہوتا ہے۔ معانی تک پہنچنا ان کے برتے سے باہر ہوتا ہے۔ لیکن لفظوں کی اوپری سطح پر ایسی قلابازیاں دِکھاتے ہیں کہ پیشہ ور نٹ بھی انھیں دیکھتے رہ جائیں۔ کرب و احساس کی مفارقت سے ان کی شناسائی نہیں ہوتی۔ یہ پیراک تو ہوتے ہیں، غوّاص نہیں ہوتے۔ میرے لکھنے سے یہ لوگ اتفاق کریں گے، ایسا مجھے نہیں لگتا، میں ریگزاروں میں رہنے والا اُردو زبان و ادب سے نابلد قرار دیا جاؤں گا۔ پھر میرے نام کے ساتھ 'چوُروی' اور لگتا ہے۔ دنیائے ادب کے لیے غیر مانوس سا لفظ سے 'چوُرو'۔

شاعر جذبات کی عکاسی اور احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ایک فطری شاعر کا یہی منصب بھی

ہے۔ خیالبازی اس کے منصب کے لیے وجہ افتخار نہیں ہوتی کیونکہ وہ کسی نہ کسی زمرے کی اتباع کو ضروری گردانتی ہے۔ شاعر طبع آزاد کا مالک ہوتا ہے اور جذبہ واحساس بھی خود مختار ہوتے ہیں۔ میں خیال کی مثال ذائقہ سے دیتا ہوں اور جذبہ واحساس کو لذت سے تعبیر کرتا ہوں۔ جس طرح ذائقے گنتی میں آتے ہیں، خیالوں کو بھی گنا جاسکتا ہے۔ لذتیں بے شمار ہوتی ہیں۔ احساسات و جذبات لاتعداد ہیں۔ ذائقہ میں کثافت ہوتی ہے۔ (خواہ جمالیاتی ہی ہو)۔ مگر لذتیں لطیف ہوتی ہیں۔ ذائقہ کا تعلق ایک خاص حاسّہ سے ہے جبکہ لذت، حواسِ خمسہ سے بقدر مشترک وابستہ ہوتی ہے۔ میں تخیل کی قوت کا منکر نہیں ہوں مگر جب پیکر محسوس بن کر اپنی شناخت دینے لگتا ہے تو اسے خیال کہا جاتا ہے۔ اس کی تعیم ہوتی ہے اور ایک طبقہ بنالیتی ہے۔ اس سے شاعر کو تھوڑی دوری بناکر رکھنا ضروری ہے ورنہ اثر آفرینی میں کمی واقع ہوگی۔

مئیں شعر کی اس دقیانوسی تعریف سے اتفاق نہیں کرتا کہ کلام موزوں بالمقصد کو شعر کہا جائیگا۔ میں حالیؔ سے بھی متفق نہیں ہوں کیونکہ وہ شعر کے لیے وزن کو ضروری نہیں سمجھتے، میں شعر میں تاثیر کو امر لازمی مانتا ہوں۔ اگر کلام موزوں و مقفّٰی جو بالمقصد ہو کو شعر کہنا پڑے تو دنیا کے بہترین اشعار میں مندرجہ ذیل شمار کیا جائے گا

اکہتر بہتر تہتر چہتر	پچھتر چھہتر ستتر اٹھتر

یا

اکیاسی، بیاسی، تراسی، چراسی	پچاسی، چھیاسی، ستاسی، اٹھاسی
فعولن فعولن فعولن فعولن	بحر متقارب سالم مثمن ہے۔

اچھے انسان کے لیے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ایک اچھا شاعر بھی ہو لیکن اس رائے سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں کہ اچھے شاعر کے لیے اچھا انسان ہونا ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ انسانیت سازی کو وہ اپنا فرضِ منصبی گردانتا ہے اور اس فریضے کی انجام دہی شاید دنیا کا سب سے مشکل کام ہے، بقول غالبؔ

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا	آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

بظاہر آدمی کے لیے سب سے آسان کام یہ ہے کہ وہ آدمی بن جائے مگر آدمی ڈاکٹر، انجینئر، مجسٹریٹ، دھناسیٹھ، بلڈر، بلیڈر (ورنہ لیڈر) تو بن سکتا ہے یا بنایا جاسکتا ہے۔ دشواری یہی ہے کہ وہ انسان نہیں بنتا۔ نذیرؔ کا پیشہ انسانیت سازی ہے، وہ بہت اچھا شاعر ہے۔ وہ بذاتِ خود ایک سیدھا سچا اور خوش خلق انسان ہے۔ اس کی سادگی، منکسر المزاجی، اس کی رفتار و گفتار، اس کی نشست و برخاست، اس

کے لباس و بود و باش کو دیکھ کر کوئی بمشکل تمام یہ باور کرے گا کہ یہ کوئی بلند پایہ شاعر و ادیب بھی ہے۔ کیونکہ نام نہاد بڑے شاعروں کے ناز و انداز، ان کی بن ٹھن، ان کی نزاکت و نفاست اور طرزِ گفتار نہایت مرغوب کن اور پُر فتن ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ان کی پرورش ہی عام انسانوں سے کچھ الگ طریق پر ہوئی ہو۔

نذیرؔ سڑک کا آدمی ہے۔ ایک مزدور پیشہ انسان ہے۔ اس کا لباس، اس کی بول چال، اس کے خدو خال، ایک غریب انسان جیسے ہیں اور وہ ویسا ہی دِکھائی دیتا ہے جیسا وہ ہے۔

نذیرؔ فتح پوری فارسی زدہ نہیں ہے۔ فارسی کے الفاظ اس نے ضرورت کیلئے یاد کر رکھے ہیں۔ اس کی زبان صاف ہے۔ یہ ماننے میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ لب ولہجہ شاعری کو چٹخارے دار بناتا ہے لیکن میرا دعویٰ ہے کہ لب ولہجہ شاعری کی رو نہیں ہے۔ زندگی کے حقائق و دقائق سے نذیرؔ بخوبی واقف ہے۔ اس کی طبع احساس اس کے جذبات کو دیانتدار بناتی ہے۔ انھیں جولانی عطا کرتی ہے۔ نذیرؔ کو خانہ زادگی سے نفرت ہے۔ وہ اُردو کو اپنے گھر کی لونڈی باندی نہیں سمجھتا۔ اس کے پاس اُس کی اپنی زبان ہے جسے پورا برصغیر بآسانی سمجھ لیتا ہے۔ وہ کسی دبستانِ ادب کا اتباع نہیں کرتا۔ وہ ایک دردمند انسان ہے اور درد اپنے اظہار میں قواعد کی پابندیوں سے بہر طور آزاد ہے۔ اس کے پہلو میں ایک محبت بھرا دل ہے۔ اس کی بولی دل کی بولی ہے، محبت کی بولی ہے ؎

حفیظ اپنی بولی محبت کی بولی — نہ ہندی نہ اُردو نہ ہندوستانی

محبت دلوں میں اپنی راہ بنانے کا ہنر رکھتی ہے۔ اپنی آواز سے ضمیروں کو جھنجھوڑنے کی نذیرؔ میں بھرپور صلاحیت ہے۔ زندگانی سے نذیرؔ کی رغبت فکر معاش کی حد تک ہے، مگر زندگی سے اس کا گہرا ربط و ضبط ہے۔ وہ مناظر فطرت کا دلدادہ ہے۔ حیاتِ انسانی سے اس کے ذوق و شوق کے رشتے عشق کی حدوں تک پہنچتے ہیں۔ اس کا دل ایک شفاف آئینہ ہے جس میں ہر لمحہ مقدس جذبات و احساسات کے واضح نقوش اُبھرتے رہتے ہیں۔ نذیرؔ، کبیرؔ، نانکؔ اور میرابائی کی زبان جانتا ہے۔ ان کی تفہیم اسے دل کی گہرائیوں میں اُترنے کا پروانہ راہ داری عطا کرتی ہے۔

نذیرؔ کا ابلقِ قلم نہایت تیز رفتار ہے۔ مگر اس کی چابکدستی اسے ہمیشہ اپنے قابو میں رکھتی ہے۔ اسے بھٹکنے یا بہکنے نہیں دیتی۔ میں نے اس کے قلم کو ابلق اس لیے کہا ہے کہ میدانِ نظم ہو یا میدانِ نثر یہ دونوں میدانوں میں یکساں دراّنی کے ساتھ دوڑتا نظر آتا ہے۔

نثر میں افسانہ ہو، ناٹک ہو، ناول ہو یا صحافت، اس کیلئے ہر میدان ہموار نظر آتا ہے۔ یہی عالم

نظم میں بھی ہے۔ غزل کو لیں تو میر تقی میرؔ کی روایات سے دوڑتا ہوا جدید غزل گو، پھر نئی غزل اور مابعد جدیدیت کے ہر میدان میں دوڑتا چلا گیا۔

پنجابی لوک گیتوں میں ماہیا وہ لطیف پیرایۂ بیان ہے جسے داخلی کیفیات و محرکات کا ایسا سرچشمہ کہہ سکتے ہیں جو ہمیشہ جاری و ساری رہتا ہو۔ ماہیے کو ہم ان چیخوں کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں جو آدھی رات کے بعد فرقت زدوں کے دل سے بلاواسطہ نکلی ہوں، ان ولوں کا ترجمان کہہ سکتے ہیں جن پر انگڑائیاں لیتے ہر موسم نے بیدردی سے ظلم ڈھائے ہوں، پھول جن کے رونے پر ہنسے ہوں، شبنم نے جن کے دہکتے ہوئے ارمانوں پر ژالہ باری کی ہو، بارش نے جن کی آتشِ نہاں کو بھڑکایا ہو، موسم سرما کی خنک ہواؤں کے لمس نے جن کے احساسِ تنہائی کو منجمد کردیا ہو اور موسم گرما نے پنکھا جھیل کر سلانے والے مہندی لگے ہاتھوں کی یاد دلاکر جن کے زخموں پر نمک پاشی کی ہو، پھدکتی تتلیوں نے ایک ڈال سے دوسری ڈال پر، ایک پھول سے دوسرے پھول پر بیٹھ کر محبوب کے ہرجائی ہونے کے اندیشوں کو اور ٹھوکر دی ہو، پنگھٹ کے قہقہوں نے جن پر ملامت کی ہو، گزرتے بنجاروں کے قافلوں نے جن کے آس کے پنچھیوں کے آخری پَر نوچ لیے ہوں۔ ماہیا چونکہ لوک گیتوں کے زمرے میں آتا ہے، اس لیے اسے عروض کی بیڑیاں پہنانا اس کی معصومیت کو ملوث کرنے کے مترادف ہے۔

لوک گیتوں کو اہلِ علم وادب اپنے ادبی سرمایہ میں شامل تو کرسکتے ہیں، اس لیے کہ ماہیے لطیف ونازک احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ انسانی جذبات کے آئینہ دار ہوتے ہیں، اس لیے کہ یہ ضمیر کو جھنجھوڑتے ہیں لیکن ان کی بے ساختگی ادیبوں کی تھوپی ہوئی سخن گیر پابندی کی متحمل نہیں ہوسکتی اور نہ ان کی محتاج ہے۔

مقامِ مسرت ہے کہ نذیرؔ نے ماہیے کی تخلیق و آبیاری میں ایک فعال کردار ادا کیا ہے اور اُن کے ماہیوں کے دو مجموعے "ریگِ رواں" اور "مٹھی بھر ماہیے" شائع ہوکر مقبولِ عام ہوچکے ہیں۔

زیر مطالعہ کتاب 'تاریخ و تذکرۂ فتح پور' نذیرؔ کی تلاش و جستجو، اس کے تخلیقی عمل اور اس کی اپنی 'جنم بھومی' سے محبت کا بے پناہ ثبوت فراہم کرتی ہے۔ 'تاریخ و تذکرۂ فتح پور شیخاواٹی' اُردو دنیا کیلئے نذیر کی حیران کردینے والی 'ادبی اور تاریخی' دریافت ہے۔ اس کتاب میں نذیرؔ نے نہایت اہتمام سے فتح پور کے نوابین کا تذکرہ مختلف تاریخی کتابوں کے حوالے سے کیا ہے۔ نئی اُردو بستیوں کے لیے یہ ایک نادر و نایاب تحفہ ہے۔ نواب نعمت خاں 'کوی جان' کی تمام کتابوں کے نام اور ان کی تاریخی کتاب 'قائم راسا' میں فارسی الفاظ کی موجودگی تلاش کرکے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ فتح پور میں اُردو فارسی کے چلن کی ابتداء

۵۰۰/ سال پہلے ہو چکی تھی۔

اس کتاب کے ہر صفحہ سے نذیرؔ کی عرق ریزی، اس کی تحقیقی ایمانداری اور اس کے عملی خلوص کا پتہ چلتا ہے۔ نذیرؔ نے ان لوگوں کو بھی اس کتاب میں پیش کیا ہے جن کا تعلق فتح پور سے نہیں لیکن ادبی طور پر جن کی شخصیتیں فتح پور کے ادبی ماحول کو متاثر کرتی رہی ہیں۔ آفتابِ شیخاواٹی حضرت خواجہ نجم الدین سے لے کر موجودہ عہد کے تمام شاعروں کا تذکرہ اس کتاب کو ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت دینے کے لیے کافی ہے۔

نذیرؔ کے قلم کا یہ رُخ دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوئی اور روحانی سکون ملا۔ نذیرؔ واقعی میری آنکھ کا آنسو ہے۔ میری روح کا کرب ہے۔ شیخاواٹی کی ادبی تاریخ کو صفحۂ قرطاس پر رقم کر کے اس نے یہ ثابت بھی کر دیا ہے۔

اعتراف

موجودہ زمانے کو آئندہ زمانے کیلئے محفوظ کردینا ہی تذکرے کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے بادشاہ، راجے اور نواب اپنے وقائع نویس اسی لیے رکھا کرتے تھے کہ ان کا زمانہ ان کی نگرانی میں، ان کی مرضی کے مطابق آئندہ زمانوں کے لیے محفوظ ہو جائے۔ اب تک جن اہلِ قلم نے تذکرے مرتب کیے ہیں ان میں سبھی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ تذکرہ لکھنا مشکل کام ہے۔ میں بھی اس اعتراف میں شامل ہوں۔ اس کے باوجود مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں نے یہ تذکرہ مرتب کیا۔ مطلوبہ مواد کی فراہمی کیلئے پیر محمد عارف فتح پوری نے سب سے زیادہ تعاون کیا۔ جناب نثار احمد راہیؔ کی قابلِ رشک یادداشت واقعات کی فراہمی میں معاون ثابت ہوئی۔ مرحوم شاہد رتلامی اور راشد ٹونکی کا کلام بھی راہیؔ صاحب کی وساطت سے دستیاب ہوا۔ عادلؔ فتح پوری اور شبیر فرازؔ نے بھی اپنے پُر خلوص تعاون سے نوازا۔ جناب صدیق غوری فائق الہندی اور جناب حاجی عثمان غنی نیلگر صاحبان کی یادداشتوں نے بھی رہنمائی فرمائی اور اس طرح فراموش کردہ فنکاروں کو زندگی عطا کرنے کا ایک راستہ نکل آیا۔ ماضی کا شہر فتح پور آج بھی پرانے لوگوں کی یادداشتوں میں محفوظ ہے۔ خواجہ غلام سرورؔ فتح پوری، حاجی غلام عیسیٰ فتح پوری، ممدو آوارہؔ کو مَیں نے اپنے بچپن میں دیکھا ہے۔ صدیق سیاں کو مَیں نے دیکھا ہے۔ سنا ہے اور ملاقات بھی کی ہے۔ بسم اللہ اور بصرہ میراثنوں نے میری شادی میں بنڑا (دولھے کیلئے گیت) گایا ہے۔ ہمارے گھر کے صحن میں برسوں ان کی آواز گونجی ہے۔ بسنتی جیسی گلوکارہ کو میں نے درگاہ حاجی نجم الدین پر حاضری کے دوران ایک بار گاتے ہوئے سنا ہے۔ مجھے ان کرداروں کے بارے میں لکھتے ہوئے بہت خوشی ہوئی ہے جن کو میں دیکھ چکا ہوں، جن سے ملاقات کا مجھے شرف حاصل ہو چکا ہے۔

فتح پور کے نوابوں کی تاریخ لکھتے وقت میرا دل جذبات سے بھر گیا۔ کئی بار آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ کبھی کبھی دل فرطِ مسرت سے کھل کھل اُٹھا۔ نوابوں کی محبتیں، رواداریاں، عوام کے لیے اُن کا خلوص، فتح پور کے نوابوں نے جس طرح ہندو رعایا کیلئے احترام اور پذیرائی کا جذبہ دِکھایا اس کی دوسری

مثال نہیں ملتی۔ اپنی ہندو رانیوں کیلئے نوابوں نے کئی مندر بنائے۔ یہ مندر آج بھی موجود ہیں۔ فتح پور کے گیارہویں نواب سردار خاں نے مانڈیلا کے قریب جب راجپوتوں اور شیخاوتوں کی تیس ہزار کی فوج سے مقابلہ کرنے کیلئے کمر کسی تو فتح پور کی عام رعایا بھی ہتھیار لے کر اپنے نواب کے ساتھ نکل پڑی۔ اس واقعے کو لکھتے وقت میرے دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی جسے میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

نوابوں کے واقعات لکھتے وقت میں نے صرف تین کتابوں پر انحصار کیا: قائم راسا، قائم خانیوں کا شودھ پورن اتہاس اور نگر فتح پور نگراں ناگر۔ فتح پور کے نوابوں کی مکمل تاریخ اُردو میں نہیں ملی، البتہ فخر التواریخ میں مختصر حالات درج ہیں۔ ان کتابوں سے من و عن واقعات بھی لیے ہیں۔ راجستھان اُردو اکادمی کے سابق سکریٹری جناب معظم علی صاحب نے 'تذکرۂ شعرائے جودھپور'، 'تذکرۂ شعرائے کوٹا'، 'تذکرۂ شعرائے ادے پور' اور 'تذکرۂ شعرائے بیکانیر' فراہم کر کے مجھے تذکرہ نگاری میں مدد کی۔ شبیر فراز، غلام دستگیر ضیاء نے تذکرہ فتح پور شیخاواٹی کے لیے اوّل سے آخر تک ہر ممکنہ تعاون دیا۔ جان کوی نعمت خان اور تاج کویتری سے متعلق ہندی ادب میں موجود تذکروں کی نشاندہی ڈاکٹر دکشت نے فرمائی اور ادھو مہاجن بسمل نے کتابوں کی فراہمی میں مدد کی۔ میں ان تمام کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

نذیر فتح پوری

موجودہ صورتحال

فتح پور میں عام طور پر اُردو کی بول چال کا ماحول نہیں ہے۔ گھروں، دوکانوں اور بازاروں میں لوگ اُردو نہیں بولتے، حتیٰ کہ وہ شعرائے کرام جن کے ذمے تخلیقِ شعر کا کام ہے وہ بھی باہمی گفت و شنید میں اُردو کو اوّلیت نہیں دیتے۔ شعر و ادب پر گفتگو، ادبی مباحث، غالبؔ اور اقبالؔ کی شاعری پر بات چیت کرتے وقت بھی اُردو کا خال خال ہی استعمال ہوتا ہے۔ شعرائے کرام سے گفتگو کرتے وقت اُردو زبان کی فطری لذتوں کا احساس تک نہیں ہوتا۔ مشاعروں اور نشستوں میں البتہ اُردو سماعتوں کا ساتھ دیتی ہے۔ یا پھر کسی بیرونی مہمان کی آمد پر لوگ اُردو میں گفتگو کرتے ہیں۔ پورے ادب و احترام کے ساتھ اُردو بولتے ہیں۔ اچھے شعر کے پارکھ یہاں موجود ہیں۔ قابلِ قدر ادبی شہ پارے پر یہاں داد و تحسین سے نوازا جاتا ہے۔ غالبؔ اور اقبالؔ کے گہرے اشعار کی پرتیں کھولنے والے بھی یہاں موجود ہیں۔ غالبؔ و اقبالؔ کا تتبع کرنے والے بھی یہاں موجود ہیں۔

اسکولوں میں اُردو شعر و ادب کا عام ماحول نہیں ہے۔ اساتذہ خود ہندی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ روزمرہ میں اُردو کی شمولیت نہیں ہے۔ درس و تدریس کے میدان میں صرف دینی مدارس ہی ایسے سائبان ہیں جہاں اُردو محفوظ ہے۔ باہر سے آئے ہوئے مولوی اور امام صاحبان ہر حال میں اُردو بولتے ہیں۔ اُردو لکھتے ہیں اور اُردو کے فروغ میں اپنی سی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن شعر و ادب سے یہ حضرات بھی کماحقہ شغف نہیں رکھتے۔ مدارس کے اجلاس کی ابتدا میں ایک قومی نظم یا کوئی نعت شریف بچوں سے پڑھا کر بات آگے بڑھا دیتے ہیں۔

فاروقیوں، پیرزادوں اور قاضیوں میں بھی اب اُردو بولنے کا چلن کم ہو گیا ہے۔ پہلے اُردو ان برادریوں کا نشانِ امتیاز ہوا کرتی تھی۔ یہ خاندان شیخاواٹی میں اُردو کے مبلّغ اور محافظ ہوا کرتے تھے۔ بچہ بچہ اُردو بولتا تھا، اُردو لکھتا تھا، اُردو پڑھتا تھا۔ اب صورتحال مختلف ہے۔

فتح پور میں اُردو کے نقوش کہیں واضح ہیں اور کہیں مبہم۔ یہاں بھی اُردو کا مستقبل وہی ہے جو پورے ہندوستان میں ہے۔ اس کے باوجود شعرائے کرام مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اُردو کو انھوں نے ہر حال میں سنبھال رکھا ہے۔ اپنے اپنے طور پر اس کی آبیاری کیلئے عرق ریزی کر رہے ہیں۔ مشاعروں اور نشستوں کے ذریعے اُردو کی تخلیقی لذتیں عوام کی سماعتوں تک پہنچا رہے ہیں۔

جب تک شعر کی تخلیق کا جذبہ رہے گا اُردو بھی زندہ رہے گی۔ ۞

قائم خانی قوم کی ابتداء

قائم خانی قوم آج پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس قوم کے بہادر، جیالے اور فہم و فراست کے دھنی افراد نے ہر زمانے میں حکمراں طبقے کو اپنی خداداد صلاحیتوں سے متاثر کیا۔ اسی لیے ان کی شخصیتیں ہمیشہ حالات پر اثرانداز رہیں۔ فتح پور کے نوابوں کی تاریخ لکھنے سے پہلے اس قوم کی پیدائش کا خاکہ پیش کرنا از حد ضروری ہے جس کے وجود میں آنے کے بعد اس کے افراد نے بہادری کی ایک ایسی تاریخ مرتب کی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔

جان کوی نعمت خاں کی تصنیف 'قائم راسا' کے مطابق:

"پونئے پال (पुन्यपाल) کا بیٹا راون ہوا۔ راون کا بیٹا تہن پال (तिहुनपाल) ہوا اور تہن پال کا بیٹا موٹے راؤ چوہان ہوا جس نے ددریوا (ददरेवा) میں راج کیا۔ اس راجا کے چار بیٹے تھے: کرم چند، جیندی، سدردی اور جگمال۔ سب سے پہلے کرم چند مسلمان ہوا۔ بادشاہ نے اس کا نام "قائم خاں" رکھا۔ جگمال کو چھوڑ کر کے باقی دو بیٹے بھی مسلمان ہو گئے۔

کرم چند کے مسلمان ہونے کی تصویر خوبصورت انداز میں جان کوی نے پیش کی ہے:

"اب میں کرم چند کی کہانی پیش کرتا ہوں، جس طرح خدا نے اسے ہندو سے مسلمان بنایا۔ ایک دن شہزادہ کرم چند کھیل رہا تھا اور اس کی زبان سے اچھے اقوال بیان ہو رہے تھے۔ ایک دن کرم چند اپنے بھائیوں کے ساتھ شکار کے لیے گیا، ان لوگوں نے جنگل میں ساور، ہرن اور روز دیکھے اور سب لوگ اپنے اپنے طریقے سے ان کا شکار کرنے کے لیے دوڑ پڑے اور شکار کی تلاش میں ایسے محو ہوئے کہ راستہ بھٹک گئے۔ کرم چند بہت تھک گیا تھا۔ اس نے ایک درخت سے گھوڑا باندھا اور آرام کی غرض سے درخت کی چھاؤں میں لیٹ گیا۔ پھر اسے گہری نیند آگئی۔

دلّی کا سلطان فیروز شاہ تغلق بھی حصار کے جنگل میں شکار کے لیے آیا۔ اس کا گزر اسی راستے سے ہوا جہاں کرم چند ایک درخت کی چھاؤں میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ دوپہر کا وقت ہے۔ سورج ڈھل گیا ہے۔ جنگل کے تمام دوسرے درختوں کی چھاؤں ڈھل گئی ہے لیکن اس درخت کی چھاؤں نہیں ڈھلی ہے جس کے نیچے کرم چند سویا ہوا ہے۔ بادشاہ کو تعجب ہوا اور وہ اس سے متاثر بھی

ہوا۔ بادشاہ نے اپنے وزیر سیّد ناصر کو یہ حیرت انگیز منظر دِکھایا۔ دونوں نے اپنے اپنے دل میں سوچا کہ یہ کوئی بڑی شخصیت کا مالک ہے۔ دونوں نے اس کراماتی شخص کو دیکھ کر کہا کہ آج ہماری تقدیر جاگ اُٹھی ہے۔ ہم اسے جگاکر قدم بوسی کریں گے۔ دونوں نے ہمت کر کے کرم چند کو نیند سے بیدار کیا۔ انھیں یہ دیکھ کر اور بھی تعجب ہوا کہ یہ شخص 'ہندو' ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوؤں میں کرامات نہیں ہوتی، اس کو خدا کی یہ نعمت کیسے ودیعت ہوئی؟ سیّد ناصر نے کہا مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ آخر میں یہ شخص اسلام قبول کرے گا۔ انھوں نے کرم چند سے پوچھا "تمہاری ذات کیا ہے۔ تم کہاں رہتے ہو؟' کرم چند نے جواب دیا' میرے گاؤں کا نام ددریوا ہے اور میرے والد کا نام موٹے راؤ ہے۔ ہماری ذات چوہان ہے اور میرا نام کرم چند ہے'۔ بادشاہ نے اسے گلے سے لگایا اور کہا' چوہان میرے ساتھ چلو۔ میں تمھیں شاہی اعزاز دوں گا'۔

اس کے بعد کرم چند مسلمان بن گیا۔ بادشاہ نے اس کا نام کرم کی مناسبت سے قائم رکھا اور وہ کرم چند چوہان سے قائم خان چوہان بن گیا۔ یہ ۷۴۸ھ مطابق ۱۴۴۱ء کا زمانہ تھا۔"

اس طرح ہندوستان کی ایک بہادر اور عزائم سے بھرپور "قومِ قائم خانی" کی بنیاد پڑی۔ فتح پور کے بنیاد گزار نواب فتح خان، قائم خان کے پوتے تھے۔

قائم خانی نوابوں کی خصوصیات

۱- دلّی دربار میں سب سے پہلے نواب قائم خان کو داخلہ ملا۔

۲- صوبہ حصار فیروزہ میں سب سے پہلے نواب قائم خان کو گورنری ملی۔

۳- قائم خانیوں میں سب سے پہلے قائم خاں ہی نے جام شہادت نوش فرمایا۔

۴- نواب محمد خاں نے سب سے پہلے راجستھان کے جھونجھنوں شہر کو پہلی قائم خانی ریاست بنایا۔

۵- ڈوسی شہر میں سب سے پہلے نواب اختیار خان نے قلعہ تعمیر کیا۔

۶- نواب فتح خان نے سب سے پہلے اپنے نام پر شہر فتح پور بسایا۔

۷- رفاہِ عام کیلئے سب سے پہلے جھونجھنوں کے نواب شمس خاں نے ایک قطعہ اراضی (بیہڑ) عوام کیلئے وقف کیا۔

۸- مغل حکومت کے زمانے میں فتح پور کے نواب الف خان کو جنرل کا عہدہ عطا کیا گیا۔

۹- قائم خانیوں میں فتح پور کے نواب درِ دولت خان، پہلے درویش مزاج اور ولی صفت ہوئے۔

۱۰- قائم خانیوں میں فدن خان کے فرزند نواب نعمت خان پہلے شاعر ہوئے جنھوں نے اپنی ستر سالہ زندگی میں ۷۶ رکتابیں مختلف موضوعات پر لکھیں جن کی تفصیل آگے درج ہے۔

۱۱- قائم خانیوں میں فتح پور کے نواب دولت خاں نے ہندوستان سے باہر جنگوں میں شامل ہو کر کابل، کندھار کے میدانِ جنگ میں وفات پائی۔

۱۲- پہلا قائم خانی نواب جیون خان تھا جو ۹۲۰ء میں دکن کی نظام شاہی حکومت میں شامل ہوا اور اپنی بہادری کے جوہر دِکھا کر گولکنڈہ کے سلطان قلی قطب شاہ سے جاگیر حاصل کی۔

۱۳- قائم خانی نواب مدن خان نے سب سے پہلے دکن کی نظام حکومت سے، رستمِ دل اور خان بہادر کا خطاب حاصل کیا اور فوج میں سپہ سالار ہوئے۔

۱۴- نواب محمد خان وہ پہلے قائم خانی ہیں جنھوں نے نظام سرکار سے 'دلاور جنگ' کا خطاب حاصل کیا۔

۱۵- نواب غلام بہاء الدین نے سب سے پہلے نظام سرکار میں گورنر کا عہدہ سنبھالا اور معین الدولہ بشیر نواب جنگ بہادر کا خطاب حاصل کیا۔

۱۶- نواب عالم علی خان دلاور جنگ نے درگاہ اجمیر شریف کیلئے سب سے پہلے دیگ تیار کرائی۔

۱۷- نواب سعادت خان نے سب سے پہلے ہریانہ کے 'دھاملاواس' کی جاگیر حاصل کی اور وہاں کا راجا کہلایا۔

۱۸- دکن میں رہ کر سب سے پہلے قائم خانی غلام یاسین خاں نے تصنیف و تالیف کا کام کیا اور 'منہاج الدارین' اور 'زیارتِ حرمین' جیسی کتابیں لکھیں۔

۱۹- حبیب اللہ خان نے سب سے پہلے اخبار نظام گزٹ کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔

۲۰- بہادر دل خاں پہلا قائم خانی ہے جس نے ۱۸۹۹ء میں علی گڑھ کا سفر صرف تعلیم حاصل کرنے کے لیے کیا۔ یہ دکن سے علی گڑھ گئے تھے۔

۲۱- انگریزی فوج میں سب سے پہلے "قائم خانی سکوارڈن' کھڑا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں بہاؤالدین خاں، موج دین خاں اور عمر خاں کے نام شامل تھے۔

۲۲- قائم خانیوں میں پہلا خانقاہی درویش جھونجھنوں کے حضرت قمر الدین شاہؒ ہیں۔

(یہ تمام ریکارڈ ۱۹۰۰ء تک کے ہیں اور قائم خانی مہاسبھا کے پانچویں اجلاس کی شائع شدہ رپورٹ سے ماخوذ ہیں۔ یہ رپورٹ ۱۱ر فروری ۱۹۸۹ء کو شائع ہوئی تھی۔)

باشندگانِ فتح پور

فتح پور میں مسلمانوں کی کم و بیش اٹھائیس[۲۸] برادریاں موجود ہیں جن میں سے چند یہ ہیں: قائم خانی، خانجی، بیوپاری، تیلی، سبزی فروش، خلیفہ، انصاری، چجارہ، چار قطب، پیرزادے، فاروقی، قاضی، سائیں، نیلگران، شیشہ گران، چھپا، بساطی، گجر، نیاریے، شیخ، مراثی، منیار، بہشتی، سیّد، لوہار وغیرہ وغیرہ۔

ان برادریوں کے افراد پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ فخر التواریخ کے مطابق سو سال پہلے یہاں صرف ہندو سیٹھ ہی تجارت پیشے سے وابستہ تھے اور فتح پور ہی نہیں بلکہ ہندوستان سے باہر چین، عدن، رنگون، لندن، برہما، نیپال، جاپان، ٹرنسوال اور امریکہ میں ان کی دوکانیں تھیں۔ فخر التواریخ کے مطابق ان سیٹھوں کی دوکانیں بیرونِ ملک نہایت آب و تاب کے ساتھ چلتی تھیں اور لاکھوں کا بیوپار کرتے تھے۔

آزادی کے بعد یہاں کی مسلم قوم نے بھی اپنی ترقی اور خوشحالی کے پیش نظر شدید مزاحمت کر کے مسدود راہوں کو ہموار کیا اور نتیجے کے طور پر آج پوری دنیا میں فتح پور کے باشندے موجود ہیں اور کاروبار میں مصروف ہیں۔ بیرون ملک روزگار کی فراہمی ہی کی وجہ سے شہر میں خوشحالی کے نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

نہیں سیلاب کا اب کوئی خطرہ گھروں کو سب نے پختہ کر لیا ہے

اونچی جدید طرزِ تعمیرات سے مزین حویلیاں، چھوٹے چھوٹے مضبوط اور خوبصورت مکان، حصول تعلیم کے لیے جگہ جگہ اسکول، یونیفارم میں ننھے ننھے بچے اسکول کی طرف دوڑتے ہوئے...... سارا منظر نامہ ہی بدل چکا ہے۔

ہندوستان کے جن علاقوں میں فتح پور کے باشندے کاروبار کرتے ہیں، ان میں کلکتہ، ممبئی، پونا، سورت، احمد آباد، بڑودہ، ناسک، پیپل گاؤں، اورنگ آباد، گوا، بنگلور...... بیرونِ ملک: کویت، بحرین، دوحہ، قطر، مسقط، صلالہ، دوبئی، شارجہ، سعودیہ عربیہ...... ہر جگہ یہاں کے لوگ ہندو مسلمان موجود ہیں اور برسوں سے کاروبار میں مصروف ہیں۔ چونکہ عام طور پر راجستھانی محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں، ایماندار اور دیانت دار بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

پہنچی جہاں جہاں ہے مرے پیار کی مہک مجھ کو وہاں وہاں سے صدا دے رہے ہیں لوگ

قیام فتح پور کے تاریخی تضادات

دن، مہینوں اور سنین میں تضادات تاریخ کے پریشان کن باب ہیں۔ فتح پور کے قیام کی تاریخ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس تاریخی تضاد کی تفصیل محبوب علی خان نے اپنی کتاب 'قائم خانیوں کا شودھ پورن اتہاس' میں اس طرح بیان کی ہے:-

"فتح پور نگر بسائے جانے کی چرچا کرتے ہوئے اتہاس کاروں، لیکھکوں نے اپنی رائے الگ الگ ظاہر کی ہے۔ مادھو ونش پرکاش کے لیکھک نے سموت ۱۵۷۸ء میں بسانا مانا ہے۔ جو قائم خاں راساہی سے میل کھاتا ہے۔ پنڈت جھابرمل شرمانے سیکر کے اتہاس میں فتح پور کا بسنا سموت ۱۵۱۰ میں مانا ہے۔ واقعات قوم قائم خانی کے لیکھک نے فتح پور کی بنیاد چیت سدی ۵ - ۱۴۵۸۔ منگلوار (۱۹ر اپریل ۱۴۰۱ء) میں رکھنا مانا ہے۔ تتھا قلعہ کا سنگِ بنیاد سموت ۴۶۲ (عیسوی ۱۴۰۵) میں رکھنا مانا ہے۔ مارواڑ کے اتہاس میں ریوجی نے بھی سموت ۱۵۱۰ میں فتح پور کا بسنا مانا ہے"۔ (صفحہ نمبر ۵۵)

محبوب علی خان آگے اپنی رائے اس طرح دیتے ہیں:

"ان سبھی ٹھوس آدھاروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فتح پور نگر سموت ۱۵۰۳ (عیسوی ۱۴۴۶) میں فتح خاں دوارا بسایا گیا۔ قلعہ کا سنگ بنیاد وکرم سموت ۱۵۰۸ (عیسوی ۱۴۵۱) میں لگایا گیا تھا اور لگ بھگ دو سال کی اودھی میں قلعہ بن کر تیار ہوا"۔

ڈاکٹر رتن لال مشر کی کتاب 'راجستھان کے ابھیلیکھ' کے حوالے سے بات کرتے ہوئے محبوب علی خاں نے لکھا ہے۔ جس کا مفہوم یہاں پیش ہے:

"جہاں فتح پور کا قلعہ بنایا گیا ہے وہاں ایک مہاتما گنگنا ناتھ جی دھونی لگا کر براجمان تھے۔ نواب کے لوگوں نے جب ان کو اُٹھایا تو مہاتما دھونی کے انگارے اپنی چادر میں لپیٹ کر چلے گئے۔ سب لوگ حیران رہ گئے۔ یہ خبر جب نواب فتح خاں کو ملی تو اس نے گھوڑا دوڑا کر مہاتما کا پیچھا کیا۔ وہ ایک جانٹ (درخت) کے نیچے دھونی لگائے بیٹھے تھے۔ نواب نے مہاتما سے واپس چلنے کی گذارش کی۔ مگر وہ نہیں مانے۔ اسی جگہ مہاتما کا

مندر موجود ہے۔ اس میں ایک سمادھی بھی ہے۔ جس میں ایک فارسی کتبہ آویزاں ہے۔ اس میں مندر کی تاریخ وکرم سموت ۱۵۴۹ درج ہے۔ فارسی عبارت اس طرح ہے:

درو مادے شاہ مارند میدار دولت خاں

جنت خاں الجخش امارتِ عنبریں خاص

نمود ۱۵۴۹

اب دیکھیں کہ جان کوی نے کیا تاریخ بتائی ہے۔

फतन भयो अतही प्रवल नम्यो न काही सीस

काहू कौ मानत नाहीं येक विना जगदीस || ३७६ ||

ترجمہ: تاج خاں کا بیٹا فتح خاں بڑا بہادر ہوا۔ اس نے کسی کے آگے سر نہیں جھکایا۔ وہ صرف خدا ہی کو مانتا تھا اور کسی کو نہیں۔

नीवं दई षंट कोट की . येक दयोंस काहि जान

नगर फतिहपुर आपनों करयों फतन असथांन || ३७७ ||

ترجمہ: فتح خاں نے ایک ہی دن میں چھ قلعوں کی بنیاد رکھی۔ فتح پور کو اس نے اپنا اہم مرکز بنایا۔

नयो वसायो फतिहपुर है सरवर उदयान

नांव आपनै फतेह खां करयो वड़ो असथांन || ३७८ ||

ترجمہ: اس نے فتح پور کو نئے سرے سے بسایا۔ پہلے یہاں پانی اور جنگل تھا۔ اس نے اسے اپنا نام دے کر بڑا مرکز بنایا۔

पंदरह सै जु अठोतरे वस्यो फतहपुर वास

सुद पांचै तिथी ही तवहिं और चैत को मास || ३७९ ||

ترجمہ: سموت ۱۵۰۸ میں فتح پور نگر بسایا گیا۔ اس وقت چیت ماہ کی پنچمی تتھی تھی۔

संन सत्तावन आठ सै जग में करयो प्रकाश

माह सफर दिन वींसवै वस्यो फतेहपुर वास || ३८० ||

ترجمہ: اس وقت ہجری سال ۸۵۷ تھا۔ جب فتح خاں نے دنیا میں اس جگہ کو مشہور کیا۔ یعنی اس کے نام کا اعلان کیا۔ صفر کے مہینے کی ۲۰ر تاریخ کو یہ بستی بسائی۔

قائم راسا کے مطابق فتح پور کے قیام کی تاریخیں اس طرح ہیں:

وکرم سموت ۱۵۰۸۔ عیسوی ۱۴۵۱ اور ہجری ۲۰؍ صفر ۸۵۷۔

محبوب علی خاں نے اوپر لکھا ہے کہ:

"شارڈل شیخاوت کے لیکھک دیوی سنگھ وکرم سموت ۱۵۰۸ میں بسانا مانتے ہیں جو قائم خاں راسا ہی سے میل کھاتا ہے"۔

میرا خیال ہے یہاں محبوب علی خاں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ کیونکہ خود محبوب علی خاں نے جو تاریخ طے کی ہے وہ قائم راسا کے عین مطابق ہے۔

دوسری طرف رام گوپال ورما نے فتح خاں کے اقتدار کا زمانہ ۱۴۳۶ء سے ۱۴۴۷ء تک بتایا ہے۔ محبوب علی خاں نے فتح پور کے بارہ نوابوں کی حکومت کے ۲۸۰؍ برس بتائے ہیں اور رام گوپال ورما نے ۲۷۹ برس لکھا ہے۔

مختصر تاریخ

فتح پور شہر کے نوابین

تاریخ کے صفحے اُلٹنے سے جن حقائق کے چہرے دِکھائی دیتے ہیں وہ حیرتوں میں ڈال دینے والے ہوتے ہیں۔ دھرتی کی انمول سچائیاں آج بھی تاریخ کی تہوں میں لپٹی پڑی ہیں۔ ایسا نہیں کہ ان تہوں کو کھولا نہیں گیا ہو۔ لیکن جس نے بھی اس میدان کی سیاحی کی ہے اپنی غرض اور اپنے مقصد کے مطابق جو ملا لے لیا اور بیلچہ رکھ دیا۔ بیلچے چلتے رہیں، تہیں کھلتی رہیں اور انکشافات ہوتے رہیں تو زندگی کی علامتیں باقی رہتی ہیں۔ تحقیق کو تخلیق ہی کا ایک حصہ سمجھنا چاہیے۔ حالانکہ تخلیق کے مقابلے میں تحقیق میں سچائی زیادہ ہوتی ہے۔ تخلیق کے مقابلے میں تحقیق پورے سچ کے ساتھ نمودار ہوتی ہے اور اپنے نقوش چھوڑ دیتی ہے۔

"قائم راسا" کے بیان کے مطابق: (ترجمہ)

"جب تاج خان کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا فتح خاں حصار کی گدی پر بیٹھا۔ فتح خاں دس بیٹوں کا باپ تھا۔ جن کے نام تھے؛ جلال خاں، ہیوت شاہ، مہم شاہ، اسد خاں، دریا شاہ، شاہ منصور، شیخ صلاح، بلو، سنگرام سور اور ہیتم۔

فتح خاں بہادر تھا۔ اس نے کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ وہ صرف خدا کو مانتا تھا اور کسی کو نہیں، فتح خاں نے ایک ہی دن میں چھ قلعوں کی بنیاد رکھی۔ اس نے فتح پور نگر کو اپنا مرکز بنایا۔ اس نے فتح پور کو از سر نو بسایا۔ پہلے یہاں پانی اور جنگل تھا۔ اس نے اس جگہ کو اپنا نام (فتح خاں کی نسبت سے فتح پور) دے کر ترقی دی۔ سموت ۱۵۰۸، (عیسوی ۱۴۵۱) کو فتح پور شہر کی بنیاد رکھی اور نام کا اعلان کیا۔ اس وقت چیت ماہ کی پنچمی تیتھی تھی۔ اس دن ہجری ۸۵۷ سال تھا۔ صفر کے مہینے کی ۲۰/ تاریخ تھی"۔

فتح پور کے بنیاد گذار نواب فتح خاں کا انتقال ۱۴۷۴ء کے آس پاس ہوا۔

نواب فتح خاں کے وقت دلّی پر بہلول لودھی کی حکومت تھی۔ رنتھمبھ کے قلعے کو فتح کرنے کے لیے فتح خان نے لودھی کا ساتھ دیا۔ یہ قلعہ فتح خاں کی بہادری اور جواں مردی سے فتح ہوا۔ بادشاہ

لودھی نے فتح خاں کو دلّی بلا کر عزت بخشی۔ سرکاری طور پر مان سمّان دیا۔ فتح خاں کی زندگی جنگ کے میدان میں گزری، لیکن وہ ہر محاذ پر کامیاب رہا، جاٹوں جاولوں سے لڑائی ہوئی۔ بھومیوں سے ٹکراؤ ہوا۔ آمیر پر حملہ کیا۔ مُسکی خان سے ٹکر لی۔ میواتیوں سے مقابلہ کیا۔ مانڈو کے سلطان حُسامدی سے پنجہ لڑایا۔ لیکن ہار کسی سے نہیں مانی، ہمیشہ جیت کے شادیانے بجاتا گزرا۔ جب بادشاہ بہلول لودھی نے اس سے رشتہ کرنا چاہا تو نواب فتح خاں نے کہا کہ میری کوئی بیٹی کنواری نہیں ہے۔ میں کوئی رشتہ نہیں کر سکتا۔ بادشاہ کو جواب پسند نہیں آیا۔ فتح خاں بھی وہاں سے ناراض ہو کر چلا گیا۔ اس کے بعد وہ کبھی دلّی نہیں گیا۔ اس نے بادشاہ لودھی کے سامنے کبھی سَر نہیں جھکایا۔ فتح خاں کے نام کی برکت ہمیشہ اس پر سایہ فگن رہی۔ وہ جہاں بھی گیا فتح اور ظفر کا پرچم اس کے ہاتھ میں رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا جلال خاں فتح پور کی گدی پر بیٹھا۔ جلال خاں نے ۱۴۷۴ء سے ۱۴۸۹ء تک نوابی کے فرائض انجام دیے۔

نواب جلال خاں : جلال خاں نے اپنے باپ کے ادھورے کاموں کو پورا کیا۔ قلعہ کا بڑا دروازہ بنایا۔ ایک پول بنائی۔ جلال خاں نے بھی دلّی کی طرف نہیں دیکھا۔ اس نے بھی اپنے باپ کی طرح کئی جنگیں لڑیں اور ہمیشہ شاد و آباد لوٹا۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی کی زمین دبانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے کبھی اپنی حدود کو پھیلانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہمیشہ اپنی زمین کی حفاظت کے لیے لڑتا رہا۔ اس نے سیکر کے راستے پر ایک بیہڑ چھوڑا تھا جس کا رقبہ ۲۴؍ میل پھیلا ہوا تھا۔ یہ بیہڑ آج بھی موجود ہے اور جانوروں کی چراگاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جلال خاں نے اپنے نام سے جلال سَر گاؤں بسایا۔ اس کی چھ بیویوں سے دس بیٹے ہوئے جن میں نواب درِ دولت خاں اوّل بڑا تھا۔ جلال خاں کے انتقال کے بعد دولت خاں کو نوابی ملی۔

نواب درِ دولت خاں : دولت خاں نے ۱۴۸۹ء سے ۱۵۱۳ء تک فتح پور کے عوام کی خدمت کی۔ یہ نواب درِ دولت خاں کے نام سے مشہور ہوئے۔ عوام میں ان کی بڑی مقبولیت تھی۔ یہ خدارسیدہ بزرگ تھے۔ ان کی کرامات کے چرچے دور دور تک تھے۔ ان کے اقوالِ زریں درج ذیل تھے:

۱- خدا سے ڈرو اور کسی سے مت ڈرو۔

۲- سب کے ساتھ ایک جیسا انصاف کرو، چاہے امیر ہو یا غریب۔

۳- ہمیشہ اپنی موت کو یاد کرو، اسے مت بھولو۔

دولت خاں کی بہادری کی مثال دیتے ہوئے جان کوی نے راسا میں لکھا ہے کہ "اگر سات

سلطان مل کر ایک ساتھ حملہ آور ہوں تب بھی وہ دولت خاں کو ہرا نہیں سکتے۔ وہ ایسا بہادر تھا۔ دولت خاں میں قدرت کی ایسی روشنی تھی کہ اس کے منہ سے جو نکل جاتا سچ ہو جاتا۔ دولت خاں کے وقت میں دلّی کا بادشاہ سکندر لودھی تھا۔ دولت خان جتنا بہادر تھا اتنا ہی رحمدل بھی تھا۔ وہ غریبوں کا بہت خیال رکھتا تھا"۔

دولت خاں کی بہادر کے واقعات بھی شیخاواٹی کی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں جس کی تاب آج بھی ماند نہیں ہوئی ہے۔ محبت خاں سارا خانی پٹھان سے اس نے لوہا لیا۔ راؤ لونکر کو ہر محاذ پر ہرایا۔ غوری اور نربانوں سے بھی اس نے دو دو ہاتھ کیے۔

نواب دولت خاں نے فتح پور کے قریب دولت آباد نام سے ایک گاؤں بسایا جو اَب فتح پور کا ایک حصہ ہے۔ نواب کے انتقال کے بعد انھیں قلعے کے جنوب کی جانب دفن کیا گیا جہاں ان کا مزار آج بھی موجود ہے۔ ہندو مسلمان عقیدت سے ان کی مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ نواب دولت خاں کی چار بیویوں سے تین بیٹے ہوئے۔ بڑا بیٹا ناہر خاں باپ کے انتقال کے بعد نواب بنا۔

نواب ناہر خاں: نواب ناہر خاں نے ۱۵۱۳ء سے ۱۵۴۵ء تک فتح پور پر راج کیا۔ جان کوی کے بیان کے مطابق ناہر خاں بہت ہی خوبصورت اور جواں مرد تھا۔ خدا نے اسے دھن دولت وراثت میں دیا تھا۔ اس کی طبیعت میں خماری تھی، وہ عیش و طرب کا متوالا تھا۔ اس نے حسین لڑکیوں کو خرید رکھا تھا۔ یہ اس کے لیے رات دن رقص و سرور کی محفلیں سجاتیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے پرکھوں کی طرح بہادر بھی تھا۔ تلوار کا دھنی تھا۔ اس کے وقت میں سکندر لودھی، ابراہیم لودھی، مغل بابر، ہمایوں اور شیر شاہ سوری پانچ بادشاہوں نے دلّی پر حکومت کی۔ شیر شاہ سوری نواب ناہر خاں کی بہت عزت کرتا تھا۔ اسے ماموں کہتا تھا۔ اپنی پسند کو ملحوظ خاطر رکھ کر نواب نے ایک بہت ہی خوبصورت محل بنایا تھا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس محل سے ناہر خاں کی اعلیٰ تعمیری سوچ کا پتہ چلتا ہے۔ اس محل کی تعمیر راسا کے مطابق ۱۵۳۶ء میں مکمل ہوئی تھی۔ وہ سوموار کا دن تھا۔

نواب ناہر خاں نے فتح پور کے شمال میں چار کوس کے فاصلے پر اپنے نام کی مناسبت سے ایک گاؤں 'ناہر سرا' آباد کیا۔ ناہر خاں کو بھی چار بیویاں تھیں، ان سے تین بیٹے ہوئے۔ ناہر کے انتقال کے بعد اس کا بڑا بیٹا فدن خاں نواب بنا۔

نواب فدن خاں: نواب فدن خاں نے ۱۵۴۵ء سے ۱۵۵۲ء تک حکومت کی۔ قائم راسا کے مطابق نواب فدن خاں کو قدرت نے علم کی دولت سے نوازا تھا۔ حکیم لقمان کی طرح اس نے اپنا

علم لوگوں میں تقسیم کیا۔ دہلی میں اس وقت بادشاہ سلیم شاہ کی حکومت تھی۔ اس نے فدن خاں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، جب فدن خاں دلّی دربار میں گیا تو بادشاہ نے اسے اپنے پاس بلا کر کہا 'فدن خاں! تم ادھر آؤ، جہاں تم کھڑے ہو وہ جگہ تمہارے قابل نہیں ہے"۔ اس کے بعد جب ہمایوں دلّی کا بادشاہ ہوا تب اس نے نواب فدن خاں کو بلا کر اس کو عزت بخشی۔ اس کے بعد جب اکبر نے دلّی کا تخت سنبھالا تب اس نے بھی دیوان فدن خاں سے بہت پیار کیا۔ اس طرح نواب فدن خاں چوہان کی عزت اور مان دنیا میں بڑھا تھا۔ اکبر کے دل میں فدن خاں کی عزت و احترام دیکھ کر ایک بار بیربل نے پوچھا 'آپ فدن خاں پر اتنا کرم کیوں فرماتے ہیں؟' اکبر نے جواب دیا 'اور تو میرے بنانے سے بڑے بنے ہیں لیکن فدن خاں کو خدا نے بڑا بنایا ہے"۔

ایک بار اکبر نے کہا 'تمہارے اور ہمارے بیچ کوئی رشتہ ہونا چاہیے، اس سے میرے دل کی آرزو پوری ہو گی'۔

فدن خاں نے اپنی بیٹی تاج اکبر سے بیاہ دی۔ اس سے دربارِ اکبری میں فدن کا احترام اور بڑھ گیا۔ دونوں اس رشتے سے بہت سکھی اور خوش ہوئے۔ یہ آگے چل کر 'تاج' کے نام سے مشہور شاعرہ ہوئی۔ (تفصیلی ذکر اسی کتاب میں آگے آئے گا۔ نذیر)۔ فدن خاں نے چورو روڈ پر فدن پورہ بسایا۔

نواب فدن خاں کے کہنے پر رائے سل شیخاوت کو اکبر کے دربار میں منصبی ملی۔

نواب فدن خاں نے بھی جنگ کے میدانوں میں اپنی خداداد حربی صلاحیتوں سے کامیابی حاصل کی اور سرخرو رہا۔ فدن خاں کی چار بیویوں سے تین بیٹے تھے، اس کے بعد اس کے بڑے بیٹے تاج خاں نے نوابی کی باگ ڈور سنبھالی۔

نواب تاج خاں : نواب تاج خاں کی نوابی کا زمانہ ۱۵۵۲ء سے شروع ہو کر ۱۵۷۰ء تک ہے۔ کوی جان نے تاج خاں کی مردانہ وجاہت کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'تاج خاں بہت خوبصورت تھا۔ اس کی خوبصورتی کے چاروں طرف چرچے تھے۔ لوگ اسے دیکھتے ہی پہچان لیتے کہ یہ تاج خاں ہے۔ تاج خاں جتنا خوبصورت تھا اتنا ہی بہادر بھی تھا۔ اس نے الور اور صدلبل پر چڑھائی کی۔ یدل گڑھ کو اس نے زیر کیا اور پٹھان سردار ملک تاج کو لوٹا۔ تاج خاں نے ریواڑی پر حملہ کر کے اسے بھی لوٹا۔

محبوب علی خاں نے اپنی کتاب 'قائم خانیوں کا شودھ پورن اتہاس' میں ان کا نام تاج خان ثانی لکھا ہے۔

تاج خاں نے اپنے نام کی مناسبت سے فتح پور کے قریب 'تاج سر' گاؤں بسایا۔ تاج خاں کے پانچ بیویوں سے آٹھ بیٹے ہوئے۔ بڑا بیٹا محمد خاں اپنے والد کی نوابی کے زمانے میں دیوان کے عہدے پر فائز تھا۔ محمد خان بھی اپنے بزرگوں کی طرح نڈر، بیباک اور تلوار کا دھنی تھا۔ اس نے کیور اور بیراٹھ پر فتح حاصل کی۔ اس نے ماںڈن کے یوراج کنبھکر کو اور گپاوت راٹھوڑ کو جنگ میں ہرایا۔ لیکن اس کی زندگی نے اس سے وفا نہیں کی۔ وہ اپنے والد تاج خاں سے پہلے ہی موت کے حوالے ہو گیا۔ اس کو پانچ بیویوں سے تین بیٹے ہوئے۔ بڑا بیٹا الف خاں تھا۔ تاج خاں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے دلّی بادشاہ اکبر کے پاس لے گیا اور عرض کی کہ الف خاں میرے خاندان میں سب سے بڑا ہے لہٰذا اسے فتح پور کی نوابی کا حقدار قرار دیا جائے۔

اکبر نے الف خاں کو پیار کیا۔ بقول جان کوی 'اکبر نے تاج خاں کے کہنے پر جب الف خاں کی طرف دیکھا تو الف خاں ایسا درخت دِکھائی دیا جس کے چکنے چکنے پات ہوتے ہیں''۔

نواب الف خاں : اپنے دادا تاج خاں کے انتقال کے بعد ۱۵۷۰ء میں الف خاں کے سر نوابی کی پگڑی بندھی۔ نواب الف خاں ۱۶۲۶ء تک نوابی کے منصب پر فائز رہا۔ جب الف خاں اکبر کے دربار میں حاضر ہوا تو اکبر نے اس کا پُر تپاک خیر مقدم کیا۔ جان کوی کے بیان کے مطابق ''اکبر نے اسے ٹیکا دیا، ہاتھی، گھوڑا اور سر وپاؤ (لباس) دیا۔ اسے اپنا چہیتا سمجھ کر فتح پور نگر اسے دیا، اس پر دیا کی، اس کے منصب کو بڑھا دیا۔ اس کا بہت مان سمّان کیا۔ باقاعدہ فرمان لکھ کر فتح پور نگر کی نوابی اسے سونپی۔ الف خاں دیوان یہ سب پا کر بہت خوش ہوا۔ الف خاں جب فرمان کے ساتھ فتح پور واپس ہوا تو گوپال پھوواں کے لڑکے شیام داس نے اس کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے فتح پور پر اپنا حق جتایا۔ محبوب خان کے مطابق نارنول کے سِکدار خاں نے آکر شیام داس کو فتح پور سے نکال دیا اور الف خاں کو تخت نشین ہونے میں مدد کی۔

الف خاں کی بہادری کی طویل داستان ہے۔ کچھ واقعات درج ہیں:

دھمیری (Dhameri) کے راجا تلوک چند نے اکبر سے بغاوت کی۔ اس کی سر کوبی کے لیے اکبر نے جگجیت سنگھ اور الف خاں کو بھیجا۔ باغیوں کی ہار ہوئی۔ دھمیری اور تہار اپر قبضہ کر لیا گیا۔

جب اکبر نے اپنے بیٹے سلیم کی قیادت میں میواڑ پر حملہ کیا تو وہ اپنے ساتھ الف خاں کو لے گیا۔ جب میواڑ کی گھیرابندی کے لیے الگ الگ تھانے بنائے گئے تو سادڑی کا تھانہ الف خاں کو سونپا گیا۔ الف خاں نے رانوں کے تھانوں پر حملے کر کے انھیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ سلیم الف خاں کی بہادری

سے بہت خوش ہوا۔ اکبر کے انتقال کے بعد جب سلیم بادشاہ ہوا تو اس نے الف خاں کی بہادری اور خدمت سے خوش ہو کر فتح پور کا لال مہر کا پٹہ دیا۔ یہ ایسی سند تھی جس سے قیادت میں تبدیلی اور بے دخلی کا خوف ختم ہو جاتا ہے۔

جہانگیر نے جب شاہزادہ پرویز کی قیادت میں دکن پر ملک عنبر کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجی تو الف خاں کو بھی ساتھ بھیجا۔ اس فوج میں ایک سے ایک بہادر شامل تھا۔ جان کوی کا بیان دیکھیے:

''شاہزادہ خود چڑھ کر عیدل آباد آگیا۔ اس نے وہاں سے فوج آگے بھیجی جس نے منباد پر قبضہ کر لیا۔ خان خاناں، خان جہاد لودھی، عبداللہ خاں زخمی، کچھواہ مان سنگھ اور بیکانیر کے رائے سینگھ راٹھوڑ، ایسے بہادر موجود تھے۔ ملک عنبر بہت بڑی فوج لے کر مقابلے کے لیے آیا۔ جس طرح آسمان میں بادلوں کی تعداد نہیں گنی جاتی اسی طرح ملک عنبر کی فوج کا شمار بھی ممکن نہیں تھا۔ خوب ڈٹ کر مقابلہ ہوا۔ بہادر عبداللہ خاں نے ایک اچھی لڑائی لڑی لیکن ملک عنبر کی فوجوں کے سامنے کوئی نہیں ٹک سکا۔ سارے تھانے اُٹھ گئے۔ لیکن ملکاپور کے محاذ پر الف خاں جما رہا۔ اس نے قدم پیچھے نہیں لیے۔ ساتھیوں نے اسے خط لکھا۔ تمھیں تھانہ چھوڑنے میں کیسی حیا ہے۔ جیسے پنچ کریں ویسا سب کو کرنا چاہیے۔ الف خاں نے جواب لکھا 'میری پیڑا سے تم دُکھی ہو رہے ہو لیکن میں اپنے بزرگوں کی غیرت کو تج کر کیسے آؤں'۔ خوب بہادری سے دونوں طرف کی فوجوں نے گولیاں برسائیں، گولے چھوڑے اور تیروں کی بوچھار کی۔ دونوں طرف لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ ملک عنبر کی فوج نے بہت جم کر اپنی بہادری کا مظاہرہ کیا۔ لیکن ملکاپور پر قابض ہونے میں ناکام رہی اور بھاگ گئی۔

جب شاہزادہ پرویز کو خبر ملی کہ سارے محاذوں پر مغل فوج کو شکست ہوئی لیکن الف خاں نے ملکاپور نہیں چھوڑا تو وہ بہت خوش ہوا اور کہا کہ الف خاں حقیقت میں اٹل خان ہے۔ ایسا بہادر دوسرا نہیں۔

الف خاں فتح پور کے نوابوں میں سب سے بہادر نواب ہوا۔ بادشاہ جہانگیر کے لیے اس نے متعدد باغیوں کو زیر کیا اور کئی محاذوں پر فتح حاصل کی۔ آخر یہ بہادر کانگڑا کی تاریخی جنگ میں شدید زخمی ہوا۔ نواب خاں کا ہاتھی جس کا نام چیتر تھا، اس نے بہت سے دشمن کے فوجیوں اور ہاتھیوں کو روندھ دیا۔ یہ جنگ ۱۶۲۶ء میں کانگڑا کے پہاڑی علاقے میں ہوئی تھی۔ اس جنگ میں مغل فوج کے بے شمار بہادر کام آئے۔ سب کے بعد زخمی ہونے والوں میں الف خاں تھا۔ جب ان کو فتح پور لایا جارہا تھا تب راستے ہی میں ان کا انتقال ہو گیا اور اس طرح موت کے ہاتھوں نے بہادر نواب الف خاں کی کتاب کا آخری صفحہ لکھ کر داستان ختم کر دی۔ سال ۱۰۳۵ء تھا۔ ۲۸ر واں روزہ تھا۔ فتح پور کے شاہی قبرستان

میں الف خاں کی تدفین عمل میں آئی۔ اس کے بیٹے نواب دولت خاں دوئم نے الف خاں کی قبر پر ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا۔ جہاں آج بھی لوگ فاتحہ خوانی کے لیے آتے ہیں۔

نواب الف خاں نے سب سے زیادہ ۵۶ر سال تک نوابی کی۔ لیکن اس کی زندگی کا پیشتر حصہ جنگ کے میدان میں بسر ہوا۔ جان کوی نے قائم راسا میں سب سے زیادہ تذکرہ الف خاں کا ہی کیا ہے۔ جان کوی نے الگ سے ایک نظم الف خاں کی پیڑی لکھ کر الف خاں کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس نظم کے آخری شعر کے مطابق الف خاں کی پیدائش ۱۵۶۴ء میں ہوئی تھی اور اس کی شہادت ۱۶۲۶ء میں ہوئی۔ الف خاں نے فتح پور سے پانچ کوس کے فاصلے پر اپنے نام کی مناسبت سے 'الف پورہ' بسایا۔ اس کی چار بیویوں سے پانچ بیٹے ہوئے۔ بڑا بیٹا دولت خاں دوئم اور اس کے بعد نعمت خاں جو جان کوی کے نام سے مشہور ہوا، جس کا مفصل بیان اسی کتاب میں آگے آئے گا۔

نواب دولت خاں دوئم :الف خاں کے انتقال کے بعد دولت خاں فتح پور کا نواب ہوا۔ اس کی نوابی کا زمانہ ۱۶۲۶ء سے ۱۶۵۳ء تک ہے۔ جہانگیر نے نواب دولت خاں کو دلّی بلا کر خلعت عطا کی، نسب دے کر اس کی شان بڑھائی اور فوجدار بنا کر کانگڑا کے باغیوں کی سرکوبی کے لیے بھیج دیا۔ جہانگیر نے کہا 'تمہارے جیسا بہادر ہی کانگڑا کے پہاڑیوں سے لوہا لے سکتا ہے۔ دولت خاں نے اپنے باپ کی طرح کانگڑا کے پہاڑیوں سے جنگ کی اور باغیوں کو کھدیڑ دیا۔ جب دلّی میں جہانگیر کا انتقال ہوا تب دولت خاں اپنی فوج کے ساتھ نگر کوٹ میں جم کر بیٹھا ہوا تھا۔ جس وقت شاہجہاں کی تاج پوشی کی خبر سنی تو فوج کے افسروں اور سپاہ سالاروں نے کام بند کر کے دلّی جانا چاہا۔ پہاڑیوں کو جب جہانگیر کی موت کی بھنک لگی اور فوج کی بزدلی کی خبر ملی تو انھوں نے پہلے کی طرح متحد ہو کر نواب دولت خاں پر حملہ کر کے اسے مار ڈالنا چاہا۔ مگر دولت خاں نے جواں مردی سے مقابلہ کیا اور باغیوں کو مار گرایا۔ پہاڑی بھاگ گئے، دولت خاں کی جیت ہوئی۔ نواب دولت خاں ۱۴ر سال تک کانگڑا کی پہاڑیوں میں رہا۔ شاہجہاں کے وقت میں جب کابل اور پیشاور میں بغاوت ہوئی تو نواب دولت خاں کو وہاں باغیوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ دولت خاں نے شاہزادہ مراد کے ساتھ بلخ بخارہ کی لڑائی میں بھی حصہ لیا۔ کچھ دنوں تک وہ ناگور کی حفاظت پر بھی معمور رہا۔

دولت خاں دوئم فنِ تعمیر سے بھی شغف رکھتا تھا۔ اس نے فتح پور کے قلعہ کی مرمت کرائی۔ قلعہ کے اطراف ایک گہری کھائی بنائی۔ فتح پور کی مشہور باوڑی جو ایک عجوبہ روزگار تھی دولت خاں نے اس وقت بنائی تھی جب اس کا باپ الف خاں نوابی کے عہدے پر فائز تھا، اس باوڑی پر ایک کتبہ اس

طرح آویزاں تھا

عجب امارت ایبا رونق بالم آنی بنائے حکم بعد وا شامدا بانی
بحکم دولت خاں شیر ابن الف خانی شدست ظاہر تاریخ جنت ثانی

باوڑی کا کام ناگور کے شیخ محمد کی نگرانی میں مکمل ہوا تھا۔ اس کی تکمیل کی تاریخ محبوب خان نے ۱۶۲۱ء بتائی ہے۔

دولت خاں نے اپنے والد مرحوم نواب الف خاں کی قبر پر جو مقبرہ تعمیر کرایا تھا وہ آج بھی ایک بے مثال گنبد کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

دولت خاں بہادر تھا۔ فنِ تعمیر کا دلدادہ تھا، عالم تھا، شاعر تھا، ادیب تھا۔ کلا پریمی تھا۔

نواب دولت خاں کا انتقال ۱۶۵۳ء میں قندھار میں ہوا۔ جان کوی نے لکھا ہے کہ دولت خاں کو موت کا بخار چڑھ گیا تھا۔ محبوب علی خان نے اپنی کتاب 'قائم خانیوں کا شودھ پورن اتہاس' میں لکھا ہے کہ دولت خاں نے ڈیڈوانہ کے قریب ایک گاؤں دولت پورہ بسایا۔ ایک قلعہ بنایا۔ ایک چوکی تعمیر کرائی اور ہتھیار رکھوائے۔

نواب سردار خاں :چونکہ نواب دولت خاں کا بڑا بیٹا طاہر خاں عین جوانی میں انتقال کر گیا۔ اس کی چار بیویوں سے دو بیٹے تھے۔ لہٰذا طاہر خان کے بڑے بیٹے نواب سردار خاں کو اپنے دادا کی جگہ مسند پر بٹھایا گیا۔ سردار خاں نے ۱۶۵۳ء سے ۱۶۸۰ء تک پورے ۲۷ برس نوابی کے فرائض انجام دیے۔

جان کوی سردار خاں کی صفات اس طرح بیان کرتا ہے: (ترجمہ)

"بادشاہ کے پاس جب دولت خاں کے انتقال کی خبر پہنچی تو اس نے اس کا ملک سردار خاں کو دیدیا۔ جب بہادر سردار خاں نوابی کی سند لے کر گھر آیا تو اس کے چاہنے والے خوش ہوئے۔ اور دشمنوں کو دُکھ پیدا ہوا۔ سردار خاں کی بات سن کر دشمنوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ان میں خوف چھا گیا۔ اس کی فوج کی گھٹا دیکھ کر ٹوڈرمل سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ سردار خاں جوش اور سچائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سرداروں میں سردار تھا اور رجپوتوں میں رجپوت۔ وہ دان اور تلوار دونوں میں بے داغ تھا۔ کسی مانگنے والے کو اس نے مایوس نہیں کیا۔ اور تلوار کو کبھی داغ نہیں لگایا۔ وہ جیالا بہادر تھا۔ جس کی شان دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔ سردار خاں جان کا سہارا ہے، آنکھوں کا تارا ہے اور جان سے بھی پیارا ہے"۔

نواب سردار کے وقت دلّی پر عالمگیر کی حکومت تھی۔ فخر التواریخ کے صفحہ نمبر ۱۴ پر لکھا ہے:

"نواب سردار خاں کے لیے ایک فرمان بادشاہ اورنگ زیب نے بیکانیر کے راجہ انوپ سنگھ کو

۱۱؍ جنوری ۱۶۶۷ء میں بھیجا تھا۔ اس میں لکھا ہے کہ 'پرگنہ فتح پور اور جھونجھنوں کے جاگیر دار الف خاں (سردار خاں کو الف خاں کا لقب ملا تھا) اجمیر کے فوجدار ضمانت خاں چکلا حصار کے مستعدی کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ پوری طرح تیار رہیں اور جنگ کے وقت ہر ممکن تعاون فراہم کریں"۔

محبوب علی خان نے لکھا ہے کہ:

"اس فرمان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نواب سردار خاں مغلوں کے منصب دار تھے۔ اور سموت ۱۷۲۴ میں ان کا موجود ہونا پایا جاتا ہے۔ اس فرمان سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اس وقت جھونجھنوں کا پرگنہ بھی نواب سردار خاں کی تحویل میں تھا۔ اورنگ زیب کالین امیر ورگ نامی کتاب میں جن امیروں کی فہرست دی گئی ہے اس میں ۳۰۷ نمبر پر سردار الف قیوام خاں نام لکھا ہے۔ اس کا ۱۵۰۰ جات ۷۰۰ سوار کا منصب دار ہونا بھی لکھا ہے۔ (قائم خانیوں کا شودھ پورن اتہاس، صفحہ ۹۵)

سردار خاں کا ایک فرزند فدن خاں کا جوانی میں انتقال ہوگیا تھا۔ اس حادثے نے نواب کو ایسا گہرا صدمہ پہنچایا کہ حکومت سے اس کی دلچسپی ختم ہوگئی اور وہ ۱۶۸۰ میں نوابی کی باگ ڈور اپنے چھوٹے بھائی دیندار خاں کو سونپ کر سبکدوش ہوگیا۔

نواب دیندار خان: نواب دیندار خان نے ۱۶۸۰ء سے ۱۷۰۳ء تک پورے ۲۳ برس فتح پور کی گدی پر نوابی کے فرائض انجام دیے۔ اس نے بھی اپنے بزرگوں کی طرح عوام کی خدمت کی۔ خدا نے اسے اچھی صحت کا مالک بنایا تھا۔ وہ وجیہہ اور بہادر بھی تھا۔ دلّی کے بادشاہ اورنگ زیب کی فوجوں کے ساتھ اکثر مہم پر جاتا رہتا تھا۔ محبوب علی خان نے رتن لال مشرا کی کتاب 'راجستھان نے ابھیلیکھ شیخاوائی پردیس' کے حوالے سے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ:

"بادشاہ نے اس کی خدمت گذاری اور بہادری سے خوش ہوکر اسے ڈیڈوانہ کا فوجدار بنایا۔ ڈیڈوانہ پرگنہ اس وقت خالصہ تھا۔ نواب دیندار خاں کا ذکر 'اجیت سنگھ اور ان کا یگ' نامی کتاب میں بھی ملتا ہے۔ لکھا ہے کہ طاہر خاں کو جودھپور کی فوجداری دی گئی وہ دیوان بھی بنایا گیا۔ شہر جودھپور کی حفاظت کے لیے عبدالحمید کو کوتوال بنایا گیا اور دیندار قائم خانی کو وقایا نویس اور حامد خاں کو قاضی کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ یہ فرمان ۱۷؍ مارچ ۱۶۷۸ء کو جاری کیا گیا تھا"۔

نواب نے اپنے نام کی نسبت سے دیندار پورہ گاؤں کی بنیاد رکھی جو فتح پور اور جھونجھنوں کے راستے میں پڑتا ہے۔ دیندار خان نے ڈیڈوانہ میں ایک دروازہ بنایا۔ اس کا نام دیندار دروازہ رکھا۔ محبوب علی خان نے اپنی کتاب میں اس دروازے کی تصویر بھی شائع کی ہے۔ یہ دروازہ اپریل ۱۶۸۱ء میں تیار ہوا تھا۔

اپنی بیٹی کے رشتے کے تعلق سے نواب نے اورنگ زیب کا مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا جس سے بادشاہ اس سے ناراض ہو گیا تھا۔ یہ ایک مفصل واقعہ ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ لیکن اس واقعے کی وجہ سے دلی دربار میں قائم خانیوں کے منصب کم ہو گئے۔

قرائن سے لگتا ہے کہ دیندار کا انتقال دہلی میں ہوا تھا۔ یہ ۱۷۰۳ء کا زمانہ تھا۔ ان کی لاش فتح پور لا کر دفنائی گئی۔

نواب دیندار خاں کی تین بیویوں سے دو بیٹے تھے۔ لیکن نوابی روایت کے مطابق ان کے بڑے بیٹے کو باپ کی گدی نہیں ملی، اس کی وجہ شاید دلی کی ناراضگی ہو۔ اس سلسلے میں حقائق معلوم نہ ہو سکے۔ دیندار خاں کے بعد رسید خان کے بیٹے سردار خاں کو تخت نشینی کا حقدار ٹھہرایا گیا۔

نواب سردار خاں دوئم :نواب سردار خاں کو ۱۷۰۳ء میں نواب بنایا گیا۔ اس نواب نے ۱۷۲۹ء تک عوام کی خدمت انجام دی۔ پورے ۲۶/ سال تک۔ اس نواب کو سوائی قائم خاں کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا منصب دو ہزار سوار تھا جسے ترقی دے کر ۲۵۰۰/ سوار کر دیا گیا تھا۔ ۱۷۱۵ء میں اس نے سانبھر پر فوجدار بھی کی۔ اس نواب کی زندگی میں ایک تیلن نے جذباتی انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ نواب نے فتح پور کے قلعہ میں اس تیلن کیلئے ایک خوبصورت محل بنایا تھا جسے 'تیلن محل' کہتے ہیں۔ نواب نے اس تیلن سے نکاح کر کے اسے شرعی حق دیا تھا۔ نواب سردار خاں کو اس کی زندگی میں راحت نہیں ملی۔ کبھی وہ اپنوں کی ناراضگیوں کا شکار رہا اور کبھی شیخاوتوں اور راجپوتوں کی سازشوں میں گھرا رہا۔ راجہ جے سنگھ نواب سردار خاں کا سخت مخالف تھا۔ ایک بار وہ نواب کے مقابلے میں ہزیمت اُٹھا چکا تھا لیکن جب اورنگ زیب کے بعد دہلی کی حکومت بھی قدرے بے اثر ہو گئی تو راجہ جے سنگھ نے آٹھ ہزار کی فوج دے کر شاردُل سنگھ شیخاوت اور سیکر کے شیو سنگھ کو فتح پور پر حملہ کرنے کیلئے روانہ کیا۔ یہ فوج راستے میں اپنی تعداد بڑھاتی ہوئی فتح پور کی جانب بڑھنے لگی۔ تنور، نربان، پٹھان، لاڈ خانی راجپوت اور کچھ قائم خانی اس فوج میں شامل ہو گئے۔ شاردُل سنگھ اور شیو سنگھ کی فوج بھی شامل ہو گئی۔ اس کے علاوہ کھیر وڑ، کھنڈ، ڈجود اور ادے پور کی فوجیں بھی شامل ہو گئیں اور اس طرح تیس ہزار سپاہیوں کی یہ فوج نواب سردار خاں کا نام صفحۂ ہستی سے مٹانے کیلئے فتح پور کی جانب بڑھنے لگی اور مانڈیلا نامی ایک دیہات میں پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ گاؤں فتح پور سے ڈھائی تین کوس کے فاصلے پر ہے۔ نواب کو جب اس طوفانی فوج کی خبر ملی تو اس نے اپنے خیر خواہ چورو کے ٹھاکر اندر سنگھ سے مدد طلب کی۔ اندر سنگھ ۱۲۰۰/ کی فوج لے کر آیا۔ خود نواب کی اپنی فوج میں ۳۰۰۰ سپاہی تھے۔ اس کے علاوہ فتح پور شہر کے تقریباً ۱۲۰۰ عوام بھی

اپنے نواب کی مدد کیلئے فوج کے ساتھ ہوگئے۔ اس کے باوجود کہ جے پور کی فوج کی تعداد نواب کے ساتھیوں سے پانچ گنا تھی۔ نواب نے ہمت نہیں ہاری اور مقابلے کیلئے نکل پڑا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی۔ نواب کی فوج کے نامی گرامی بہادر اس جنگ میں کام آئے۔ نواب خود بھی زخمی ہوگیا اور پلٹ کر قلعہ میں راحت لی۔ اس کے بعد سردار خاں اپنی تیلن بیوی کو لے کر نارنول چلا گیا لیکن اس کے زخموں نے کسی بھی طرح مرہم سے سمجھوتہ نہیں کیا اور نواب سردار خان دوئم عرف سوائی قائم خان ۱۷۲۹ء میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

جے پور رپورٹ ۹۲-۹۱-۹۰ سرکار کلکشن 'قائم خانی ونش کا اتہاس - از ڈاکٹر رتن لال مشر' کے مطابق جے پور کے سوائی جے سنگھ نے دلّی کے بادشاہ کے اشارے پر فتح پور کی نوابی کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

آخری نواب: سردار خاں کے چلے جانے کے بعد ان کے گود لیے ہوئے بیٹے قائم خاں کو فتح پور کی گدی پر بٹھا دیا گیا لیکن قائم خاں کمزور تھا، بے بس تھا۔ راجپوتوں اور شیخاوتوں کی گرفت میں تھا۔ پھر ایک سازش میں پھنسا کر سیکر کے شیو سنگھ نے نواب کو بے بس کر دیا اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے فتح پور کے قلعہ پر قابض ہوگیا۔ نواب قائم خاں فتح پور کی نوابی کو آخری سلام کر کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کچامن چلے گئے۔ اس کے بعد بیکانیر کے راجہ جورآور سنگھ کے پاس گئے۔ راجہ نے نواب کو پورے احترام کے ساتھ اپنے پاس رکھا۔ کچھ دنوں بعد جودھپور کے وجے سنگھ کو جیاپا مراٹھا سردار نے ناگور کے قلعہ میں گھیر لیا تو بیکانیر کے راجہ ان کی مدد کیلئے گئے۔ نواب بھی اپنی فوج کے ساتھ اس جنگ میں شامل ہوا اور شہید ہوگیا۔ قائم خاں کی نوابی کی عمر صرف ایک سال تھی۔ ابتداء ۱۷۲۹ء - انتہا ۱۷۳۰ء۔

اس طرح فتح پور کے نوابوں کا سنہری دَور آخری سانس لے کر ختم ہوگیا۔ فتح پور کے نواب غیر متعصب تھے بلکہ مسلمانوں سے زیادہ انھوں نے ہندو رعایا کو اپنے قریب رکھا۔ ان دنوں فتح پور کی تجارتی منڈی پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ نوابوں کے دَورِ اقتدار میں مندروں کی تعمیر کثرت سے ہوئی، مسجدیں کم بنیں۔ فتح پور کے سنت کوی سندر داس کا نواب کے دربار میں بڑا احترام تھا۔ نوابوں کی بیگمات بھی ہندو گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ فتح پور کے کسی بھی نواب نے کبھی مذہبی بنیادوں پر جنگ نہیں لڑی۔ انھوں نے سادھو سنتوں کا ہمیشہ احترام کیا۔ فتح پور کے نوابین کے سکولر کردار کی مثال نہیں ملتی۔

❁❁❁

شہنشاہ بابر فتح پور میں

یہ تب کی بات ہے جب دلّی پر سکندر لودھی کی حکومت تھی۔ فتح پور میں اس وقت نواب دولت خان کا راج تھا۔ اس وقت بابر ایک قلندر کے بھیس میں ہندوستان آیا تھا۔ اپنے اس سفر کے دوران بابر نے فتح پور کا سفر بھی کیا تھا۔ رام گوپال ورما نے اپنی کتاب 'نگر فتح پور نگراں ناگر' کے صفحہ ۱۴ پر قائم راسا کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے، اس کا ترجمہ پیش ہے:

''ہندوستان کا ہونے والا بادشاہ بابر یہاں کے سیاسی اور سماجی حالات کا جائزہ لینے کیلئے فتح پور بھی آیا تھا۔ اس وقت نواب درِ دولت خان فتح پور کی نوابی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ فقیر (بابر) کے ساتھ ایک شیر بھی تھا۔ دونوں کی بھوک بیدار ہوئی۔ نواب درِ دولت خان نے دعوت دی۔ بابر نے شیر کیلئے گائے کے گوشت کا مطالبہ کیا۔ نواب دولت خان نے اپنی ہندو رعایا کا خیال کرتے ہوئے گائے کا گوشت دینے سے انکار کیا۔ فقیر نے ضد کی۔ دعوت کو ٹھکرا دیا تب نواب نے شیر کے سامنے گائے کا بچھڑا چھوڑ دیا۔ نواب کی روحانیت کا امتحان ہوا۔ شیر کی کیا مجال کہ وہ گائے پر جھپٹ جائے۔ فقیر کابل جاتا ہے۔ وہاں جاکر وہ اپنے ہم وطنوں کے سامنے ہندوستان کے تین جاں باز اور بہادروں کا ذکر کرتا ہے (۱) سکندر لودھی۔ (۲) حسن خاں میواتی۔ (۳) نواب درِ دولت خان''۔

فخر التواریخ نے اس واقعہ کو یوں نقل کیا ہے:

''منقول ہے کہ بابر شاہ مغل ولایت سے قلندرانہ لباس میں ہندوستان آیا تو اس کا گزر قصبہ فتح پور میں بھی ہوا۔ بابر شاہ کی سواری میں ایک شیر نر تھا۔ نواب دولت خان جو صاحب باطن تھا، بابر شاہ سے ملنے کو گیا۔ بابر نے نواب سے استدعا کی کہ ہمارا شیر تین روز سے بھوکا ہے، اس کو ایک گائے منگادو تاکہ اس کے گوشت سے شکم پُر کرلے۔ نواب نے گائے کو منگا کر شیر کے سامنے کھڑی کرادی۔ شیر نے اس پر حملے کا قصد کیا۔ نواب نے شیر کو للکارا کہ خبردار اگر اس پر وار کیا تو تیرے حق میں بہتر نہ ہوگا۔ شیر پیچھے کو ہٹ گیا۔ اس طرح تین مرتبہ شیر نے گائے کے مارنے سے اپنے حملے واپس کیے۔

بالآخر بابر شاہ نے التجا کی کہ اجازت دو کہ یہ اپنی شکم پوری کر لیوے۔ تین روز سے اس نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ تب نواب نے شیر کو اجازت دی اور شیر نے اس کو کھایا"۔ (بحوالہ فخر التواریخ صفحہ ۵-۶)

لیکن محبوب علی خان مؤرخ شیخاواٹی نے اپنی کتاب 'قائم خانیوں کا شودھ پورن اتہاس' میں بابر سے متعلق جو لکھا ہے اس کی حقیقت تصویر کا دوسرا ہی رُخ پیش کرتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"نواب دولت خان ایک ایسا نواب تھا جو فتح پور کے راجیہ کی جنتا کے دلوں میں پریم پُروک بسا تھا۔ یہ دھارمک پرورتی کے ایک پہنچے ہوئے انسان تھے۔ راسا نے (قائم راسا) ایک گھٹنا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بابر نامک سنت ان کی کرامت کی پریکشا (امتحان) لینے ایک شیر کو زنجیر سے پکڑ کر فتح پور آکر ٹھہرا۔ اس نے نواب دولت خان کی کرامت کو آزمانے کی سوچی، دولت خان نے فقیری ویش ہونے کے کارن اسے دعوت دی۔ جب وہ دعوت میں قلعہ پر پہنچا تو اس نے بھوجن کے لیے انکار کیا اور کہا کہ میرا شیر تین دن سے بھوکا ہے۔ جب تک اسے کھانا نہیں ملتا میں بھوجن نہیں کروں گا اور یہ گائے کا ماس ہی کھاتا ہے۔ نواب دولت خان نے کہا کہ ہم چوہان ونسی ہیں اور جنتا کے لوگ ہندو ہیں۔ ہم گوؤں کے رکھشک ہیں۔ کسی اور جانور کا ماس کھلادیں۔ پر اس نے انکار کردیا۔ تب دولت خان نے ایک بچھیا منگوائی اور دور بندھوادی۔ پھر کہا کہ اب اپنے شیر سے کہو کہ کھالے۔ جب بابر نے شیر چھوڑا اور وہ بچھیا کی اور بڑھا تو دولت خان نے "سبھناد" کے ساتھ شیر کو لتاڑا۔ شیر اس کے آدیش کا پالن کرتے ہوئے واپس بیٹھ گیا۔ بابر تو اس کی پرکشا لینا چاہتا تھا"۔

یہاں تک تو پورا واقعہ تقریباً وہی ہے جو اوپر دو کتابوں کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن محبوب علی خان کی آگے کی سطریں تاریخ کی ایک بہت بڑی سچائی سے انحراف کرتی ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"وہ سنت (بابر) نواب دولت خان سے اتنا پربھاوت ہوا کہ فتح پور کے پچھم میں ایک ستھان پر اپنا ڈیرہ کیا۔ ان کے انتقال کے بعد اسی ستھان پر انھیں دفنایا گیا جہاں ان کی مزار ہے۔ جو شیر سلطان کے نام سے جانی جاتی ہے۔

(بحوالہ: قائم خانیوں کا شودھ پورن اتہاس۔ صفحہ نمبر ۶۵۔ سنہ اشاعت ۱۹۹۷ء)

فخر التواریخ، نگر فتح پور نگراں ناگر اور قائم خانیوں کا شودھ پورن اتہاس، تینوں کتابوں میں یہ واقعہ قائم راسا کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ اب دیکھیں قائم راسا میں اس واقعہ کو کس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ راسا کے نثری مترجم نے سلطان بابر سے دولت خان کی ملاقات اس طرح بیان کی ہے:

☆ بابر کابل سے چل کر دلی دیکھنے آیا، اس نے قلندر کا ویش دھارن کیا اور ساتھ میں ایک باگھ لایا۔

☆ آتے آتے وہ فتح پور میں آگیا، اس نے دولت خان سے مل کر یہ کہا کہ باگھ کیلئے ایک گائے منگاؤ۔

☆ آج ہمارا باگھ تین دن سے بھوکا ہے، اس کے کھانے کو گائے منگاؤ تا کہ ہماری اچھا پورن ہو۔

☆ دولت خاں دیوان نے گائے منگائی، پر یہ کہا کہ میں دیکھتا ہوں میرے دیکھتے باگھ گائے کو کیسے کھاتا ہے۔

☆ جب باگھ گائے کو مارنے کو اُٹھا، اس نے گائے کو نکٹ (قریب) سے دیکھا، دیوان دولت خاں نے تب ہانک لگائی، باگھ اس سے گائے کو نہیں کھا سکا۔

☆ باگھ گائے کی اور پھر اُٹھ کر چلا۔ دیوان نے اسے پھر ہنٹک دیا۔ اس پر باگھ وہیں کا وہیں کھڑا رہا اور گائے کو نہیں کھانے پایا۔

☆ تب بابر نے کہا کہ دولت خاں تم نے گائے کی رکھشا کرلی۔ تم نے واگھ کے ساتھ ایسا کیا۔

☆ ستیہ پروشوں کی کڑی درشٹی کو باگھ نہیں سہہ سکتا۔ سِھوُں کی ہنکار سن کر ہاتھیوں کا مد بھی سوکھ جاتا ہے۔

☆ بابر یہاں سے چل کر الور آیا۔ اس نے بھرست ہو کر حسن خان میواتی کے کٹک کو دیکھا۔

☆ وہاں سے وہ دلّی گیا اور سکندر شاہ کو دیکھا۔ اس پرکار سارے ہندوستان کی تھاہ لے کر وہ کابل پہنچا۔

☆ لوگ اسے دلی منڈل کی باتیں پوچھنے آئے تو اس نے کہا کہ میں نے تین ہی بڑی باتیں دیکھی ہیں۔

☆ مَیں نے ایسے تین پروش دیکھے جو سارے ہندوستان میں مشہور ہیں، ان کے سمان دوسرا جگت میں کوئی بھی نظر نہیں آتا۔

☆ ایک دلی کا بادشاہ سکندر تھا، دوسرا میواتی حسن خاں تھا جس کے پاس اسنکھیئے (بے شمار) کٹک تھا۔

☆ تیسرا فتح پور آکر دولت خاں کو دیکھا جس کے ڈر سے باگھ گائے نہیں مار سکا۔

☆ دولت خان چوہان کا کیا ورنن کریں، وہ آپر تمک یودھا کے ساتھ ساتھ دینوں (غریبوں) پر دیا کرنے والا، دان دینے والا تھا۔

محبوب علی خان نے معلوم نہیں کن بنیادوں پر لکھ دیا کہ سنت بابر نے فتح پور ہی میں قیام کیا۔ اس کے انتقال کے بعد اسے فتح پور کے مغربی حصہ میں دفن کیا گیا جہاں اس کا مزار 'شیر سلطان' کی درگاہ کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ جبکہ راسا ہمیں بتاتا ہے کہ بابر الور سے ہوتا ہوا کابل پہنچا وہاں جا کر اس نے جن تین ہندوستانی بہادروں کی تعریف کی ان میں ایک نام نواب در دولت خاں کا بھی ہے۔

ڈاکٹر رتن لال مشرا نے قائم راسا کا نثری ترجمہ کیا ہے۔ مترجم نے ترجمے سے قبل تاریخی

تناظر میں راسا پر گہری تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے۔ جان کوی کی متعدد تاریخی گفتگو سے مشراجی نے اختلاف کیا ہے۔ بابر اور دولت خان کی ملاقات کو بھی موصوف نے فرضی قرار دیا ہے۔ لکھا ہے:

"یہ من گھڑت کتھا ہے"۔ (صفحہ نمبر ۱۱۹)

ایک ملاقات میں مجھے محمد عارف پیرجی نے بتایا کہ "شیر سلطان" کے نام سے جو مزار مشہور ہے یہ اسی شیر کی قبر ہے جو بابر اپنے ساتھ لایا تھا۔ اضافت کے ساتھ پڑھا جائے تو "شیرِ سلطان" یعنی کہ سلطان کا شیر یعنی موجودہ مزار سلطان کے شیر کا ہے۔ اور یہی قرینِ قیاس ہے۔ ممکن ہے آگے کی تحقیق مزید کچھ پردے اُٹھادے۔

جان کوی نعمت خان

جان کوی کا پیدائشی نام نعمت خان تھا۔ نعمت خان فتح پور کے ساتویں نواب دیوان الف خان کے پانچ بیٹوں میں دوسرا بیٹا تھا۔ نواب الف خان ۱۵۷۰ء سے ۱۶۲۶ء تک نواب رہے۔ قائم خان راسا کا مخطوطہ جب پہلی بار دستیاب ہوا تو ہندی کے مشہور محققوں نے اسے نواب الف خان کی تخلیق بتائی مگر بعد کی تحقیق میں جب جان کوی کے دوسرے ۷۵ مسودے مختلف موضوعات پر دستیاب ہوئے تو محققین کو اپنی رائے بدلنی پڑی اور اس بات پر اتفاق ہوا کہ جان کوی نواب الف خان کا فرزند نعمت خان ہے۔

جانؔ کوی تخلیقی اعتبار سے بڑا خلاّق اور گوناگوں خوبیوں کا مالک تھا۔ ہندی کے ایک دانشور نے جان کوی کی تخلیقی قوتوں کا اعتراف کرتے ہوئے یہاں تک لکھا ہے کہ، جتنی مختلف النوع اقسام کی تخلیقات جانؔ نے پیش کی ہیں، اتنی اس وقت کے کسی ہندو یا جین شاعر یا دانشور نے پیش نہیں کیں۔ جانؔ کوی کی تخلیقات دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے مختلف علوم سے کماحقہ واقفیت رکھتا تھا۔ خاص طور سے ہندو دھرم کے گرنتھوں، شاستروں اور کتھاؤں کا اسے گہرا علم تھا۔ جس کا اظہار جانؔ نے اپنی تخلیقات میں جگہ جگہ کیا ہے۔

جانؔ چوہان خاندان سے تھا۔ اس کے دل میں اپنے چوہان ہونے کا بڑا فخر تھا۔ قائم خان راسا میں جگہ جگہ اس نے چوہان ونش کو اعلیٰ اور ممتاز بتا کر پیش کیا ہے۔

جانؔ کی مادری زبان کا علم نہیں ہو سکا لیکن تخلیقی طور پر اس نے جو زبان استعمال کی ہے اسے پرانی راجستھانی بتایا گیا ہے۔ بعض نے اسے راجستھانی-گوجری اور بعض نے اسے مارو-گجر بتایا ہے۔ اور بعض نے اسے ڈنگل لکھا ہے۔ قائم خان راسا میں مختلف زبانوں کا تخلیقی امتزاج موجود ہے جس میں برج بھاشا کا استعمال بدرجہ اتم ہوا ہے۔ اُردو اور فارسی کے علاوہ کہیں کہیں پنجابی کے لفظ بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ قائم خان راسا میں مقامی بولی کا بھی برملا استعمال کیا گیا ہے، جو بہت ہی خوبصورت ہے۔ ہندی بھاشا کے وِدوانوں اور دانشوروں نے جانؔ کوی کی زبان کو آسان اور جذبات سے لبریز بتایا ہے۔ جانؔ مختلف زبانوں کا ماہر تھا اور ان کے تخلیقی اظہار پر قادر تھا۔ اس کے باوجود اس نے دو ایک جگہ الفاظ کو توڑ مروڑ

کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس جگہ اس نے بکنا کو بولنے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

جان تمثیلوں، استعاروں اور تشبیہوں کا بادشاہ تھا۔ زبانوں کا امام تھا۔ واقعات کی منظر کشی کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔ ہندی چھندوں پر اس کو عبور حاصل تھا۔ دوہے کا مزاج داں تھا۔ قائم راسا مختلف بحور میں لکھ کر اس نے اپنی بے پناہ تخلیقی مہارت کا لوہا منوایا ہے۔ جان کوی نعمت خان نے ایسے خاندان میں آنکھیں کھولی تھیں جہاں شب و روز جنگ کے بادل سروں پر چھائے رہتے تھے۔ جس خاندان کے نوجوان صرف تلواروں کی گفتگو کرتے تھے، جہاں تخت و تاج کے لیے خون کی ندیاں بہہ جایا کرتی تھیں، جہاں ہاتھیوں کی چنگھاڑ اور گھوڑوں کی ٹاپوں کے شور سے سماعتیں خوف زدہ رہا کرتی تھیں، ایسے میں ایک شاعر، ایک تخلیق کار کا پیدا ہونا قدرت کا انعام ہی سمجھا جائے گا۔

جان کوی کا تخلیق کردہ قائم خان راسا اس کے اپنے خاندان کی بہادری کی داستان بیان کرتا ہے اس لیے اس میں جان کے جذبات بھی کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ جان اپنے آباء و اجداد کی بہادری اور جواں مردی پر ہلکی سی خراش بھی برداشت نہیں کرتا۔ شاید اسی لیے اس نے کمزور پہلوؤں کو نظر انداز کیا ہے۔

جان کوی نے تقریباً ستر سال کی عمر پائی جس میں اس نے پچاس سال تک اپنے قلم کے جوہر دِکھائے۔ جب اس کے بھائی میدانِ جنگ میں اپنی تلوار کے جوہر دِکھاتے تو جان کوی محل کے کسی پُر سکون کمرے میں بیٹھ کر اپنی تخلیقی اُپج کو الفاظ کا روپ دے کر قرطاس کے حوالے کرنے میں مشغول رہتا۔ اس کے اس شغل نے ۷۶ رکتابوں کو وجود عطا کیا۔ لیکن قائم خان راسا کے علاوہ ابھی تک کوئی اور کتاب شائع نہیں ہوئی۔ راسا کی تخلیق کا زمانہ ۱۶۷۶ء بتایا گیا ہے۔ یہ قائم خانی سماج پر پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب کی اشاعت ۲۷۷ر سال کے بعد ۱۹۵۳ء میں پہلی مرتبہ ہوئی۔

جان کوی نے ہانسی کے ایک بزرگ شیخ محمد چشتی کو اپنا استاد بتایا ہے۔

شیخ محمد میرو پیر ہانسی ٹھام گنین گمبھیر
شیخ محمد پیر ہمارو جا کو نام جگت اجیارو

دراصل ہانسی کے ان بزرگوں کا سلسلہ چار قطب والوں کا خاندان کہلاتا ہے۔ اس خاندان میں چار قطب ہوئے تھے۔ ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں: جمال، برہان، انور اور نور الدین (علیہم الرحمۃ) چار قطب کا خاندان فتح پور میں آج بھی آباد ہے اور 'چار قطب والے پیر' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

جان کوی نے اپنے والد کے پانچ بیٹوں کی تفصیل ایک دوہے میں اس طرح بیان کی ہے:

بڈو دولت خانو ہے دو جو نعمت خان
خان سریف، ظریف خان پونی فقیر خاں جان

یعنی نواب الف خاں کے پانچ بیٹے ہوئے، ان میں بڑا دولت خان تھا، دوسرا نعمت خان، اس کے بعد سریف خان، اس کے بعد ظریف خان اور بعد میں فقیر خان۔

جانؔ کوی اپنے والد کی تاج پوشی کا ذکر دوہوں میں کرتے ہیں، پہلا دوہا ۔

جب ہی بھئے بس کال کے تاج خانو سر مور الف خانو دیوان تب بیٹھے ان کی ٹھور

یعنی جب نواب تاج خان کا انتقال ہوا تو نواب الف خان ان کی جگہ گدّی پر بیٹھے۔

ٹیکے دیوے جلال دی، گز گھوڑا سر پاؤ نگر فتیچپور پونی دیو، چھتر پتی آیو بھاؤ

یعنی اکبر نے اسے ٹیکا دیا، ہاتھی گھوڑا اور سر وپاؤ دیا، اسے اپنا چہیتا سمجھ کر فتح پور نگر دیا۔

پات ساہ کینی میا، بڑھیو منصب مان دیو فتیچپور چھترپتی، لکھی اپنو فرمان

یعنی بادشاہ اکبر نے اس پر کرم کیا، اس کے منصب میں اضافہ کیا۔ اس کا مان سمان بڑھایا۔ بادشاہ نے اپنا فرمان لکھ کر اسے فتح پور دیا۔ الف خان دیوان کو یہ سب پاکر بڑی خوشی ہوئی۔

جانؔ کوی نعمت خان کا لکھا ہوا قائم خان راسا ایک تاریخی مکالمہ ہے جسے فتح پور کے تخلیقی اور ادبی شعور کی عمارت کا سنگ بنیاد کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔

راسا کے تجزیاتی مطالعے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ تاہم قائم راسا پر تجزیاتی کام کی سخت ضرورت ہے۔ اگر اس کا ترجمہ اُردو میں ہو جائے تو اس کی تفہیم کے مزید راستے کھل سکتے ہیں۔

راسا میں فارسی الفاظ

فتح پور کے نوابوں کا دلّی کے بادشاہوں سے گہرا تعلق رہا ہے۔ فتح پور کی نوابی دلّی شاہی کے تسلط میں رہی ہے۔ دلّی کی دفتری اور درباری زبان چونکہ فارسی تھی اور عوام میں اُردو کا رواج پڑ چکا تھا اس لیے فتح پور میں فارسی کا چلن تھا۔ جان کوی نعمت خان فارسی کا ماہر بھی تھا، لہٰذا تخلیقی سطح پر فارسی سے دامن بچانا اس کیلئے غیر فطری سی بات تھی۔ راسا میں فارسی کے جو لفظ اپنی لسانی تہذیب کے ساتھ استعمال میں آئے ہیں ان کی ایک نامکمل فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

محل، سلطان، ارب خرب، باقی، دریا، لہر، رستم، دخل، بے ادبی، زین، لوہا، جنگل، گمراہ، تابوت، خبر، وطن، پیغمبر، جہان، کرامت، پیر، قطب، دربار، فوج، فوج دار، تیغ، تسلیم، تخت، صاحب، عرض،

میاں، مجال، حکم، زیر، آج اور کل، مجاہد، جمال، کمال، جنگ، منصب، نامی، گرد، مرد، ہمت، زخمی، گرز بردار۔

جن الفاظ میں تصرف کیا ہے یا جن کو راسا کی بنیادی زبان میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اس کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔ یہ فہرست بھی مکمل نہیں ہے۔

اصل	تصرف کے بعد	اصل	تصرف کے بعد	اصل	تصرف کے بعد
جہاز	چہاز	لہو	لوہو	شمشیر	سمسیر
پیش کش	پیس کس	شہادت	سہادت	حضور	خضور
فرمان	ٖفرمان	بہشت	بھیست	سوار	اسوار
شہنشاہ	سہنساہ	ضمانت	ضمان	فیل وان	پیل وان
تلوار	تروار	چابک	چابک	شور	سور
نشان	نسان	سرتاج	سِر تاج	شاہ	ساہ
شکار	سکار	پروین	پربین	پیش	پیس
فتح	فتیح	مہر	موہر		

جانؔ کوی نعمت خان کی کتابوں کے نام

ڈاکٹر ادے شنکر سری واستو اپنی کتاب 'مدھیہ یوگین ہندی کے اِتر مسلمان کوی' میں رقمطراز ہیں:

"نعمت خان (جانؔ کوی) فتح پور کے بنیاد گذار اوّل نواب فتح خان کے خاندان سے تھے۔ ان کے والد کا نام الف خاں تھا۔ خاندانی سلسلہ اس طرح ہے: فتح خاں۔ جلال خاں۔ دولت خاں۔ ناہر خاں۔ فدن خاں۔ تاج خاں۔ الف خاں۔ نعمت خاں (جانؔ) ان کی شاعری کا زمانہ سموت ۱۶۷۱ سے ۱۷۲۱ تک ہے۔ (۱۶۱۴ء سے ۱۶۶۴ء تک) یہ عربی، فارسی، سنسکرت زبانوں کے ماہر اور اچھے تاریخ داں اور فطری شاعر تھے۔ انھوں نے خوبصورتی کی نمائندہ اور عشق کے جذبات سے مملو تخلیقات پیش کیں۔ جن سے ان کے خوبصورت اور بھرپور فنکار ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

جانؔ کوی نے ۷۵ گرنتھوں کی رچنا کی: (۱) مدن ونود۔ (۲) گیان دیپ۔ (۳) قائم راسا۔ (۴) پُہپ ورکھا۔ (۵) رس منجری۔ (۶) الف خاں کی پیڑی۔ (۷) بروا گرنتھ۔ (۸) چھبی ساگر۔ (۹) موہنی۔ (۱۰) کنولاوتی کتھا۔ (۱۱) کلاوتی کتھا۔ (۱۲) چھیتا کی کتھا۔ (۱۳) روپ منجری۔ (۱۴) چندر

سین راجا سیل ندھان کی کتھا۔ (۱۵) کتھا اردیسر پاتی شاہ کی۔ (۱۶) کامرانی یا پتیم داس کی کتھا۔ (۱۷) بلو کیا وری کی کتھا۔ (۱۸) تمیم انصاری کی کتھا۔ (۱۹) کتھا قلندر کی۔ (۲۰) کتھا نرمل کی۔ (۲۱) کتھا کلونتی کی۔ (۲۲) کتھا ستونتی کی۔ (۲۳) کتھا سیلونتی کی۔ (۲۴) کتھا خضر خاں شاہزادے و دیول دے کی۔ (۲۵) کنکاوتی کی کتھا۔ (۲۶) کوتہلی کی کتھا۔ (۲۷) کتھا سبھٹ رائے کی۔ (۲۸) کاملتا کتھا۔ (۲۹) بدھ ساگر۔ (۳۰) سیش گرنتھ۔ (۳۱) سدھا سکھ گرنتھ۔ (۳۲) بدھی دائک۔ (۳۳) بدھی دیپ۔ (۳۴) بارہ ماسہ۔ (۳۵) گوڈھ گرنتھ۔ (۳۶) دشاولی۔ (۳۷) رس کوش۔ (۳۸) اُتم سبدھ۔ (۳۹) سکھیا ساگر۔ (۴۰) ویدک سِکھ شتپت۔ (۴۱) سنگھار تلک۔ (۴۲) پریم ساگر۔ (۴۳) ویوگ ساگر۔ (۴۴) پا ہن پرچھا۔ (۴۵) سنگھار شتک۔ (۴۶) بھاؤ شتک۔ (۴۷) ورہا ساگر۔ (۴۸) گھونگھٹ نامہ۔ (۴۹) درس نامہ۔ (۵۰) بازنامہ۔ (۵۱) الک نامہ۔ (۵۲) درسن نامہ۔ (۵۳) وزن نامہ۔ (۵۴) ست نامہ۔ (۵۵) باندی نامہ۔ (۵۶) کبوتر نامہ۔ (۵۷) پیمو نامہ۔ (۵۸) ظفرنامہ نوسیرواں کا۔ (۵۹) پدنامہ۔ (۶۰) سٹ رِتو پوگم چھند۔ (۶۱) رس ترنگنی۔ (۶۲) رتن منجری۔ (۶۳) نل دمینتی۔ (۶۴) مان ونود۔ (۶۵) ورہی کو منورتھ۔ (۶۶) بھاؤ کللول۔ (۶۷) کندرک کللول۔ (۶۸) نام مالا انیک ارتھی۔ (۶۹) رتناولی۔ (۷۰) سدھا ساگر۔ (۷۱) لیلیٰ مجنوں۔ (۷۲) سواس سنگرہ۔ (۷۳) ویدک متی۔ (۷۴) چیتن نامہ۔ (۷۵) کوی ولبھ۔ (صفحہ نمبر ۳۳۰-۳۴۰)

آچاریہ پرشورام چترویدی نے اپنی کتاب 'صوفی کاویا سنگرہ' میں لکھا ہے کہ:

"جان کوی ہر حال میں شاعر پہلے تھے اس کے بعد صوفی کہے جاسکتے ہیں۔ ان کی جو عشق کی داستانیں صوفی پریم گاتھاؤں کے تحت آسکتی ہیں ان میں کچھ ادنیٰ اشاروں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ یہ خدا کی حمد کرتے ہیں۔ محمدؐ کے گن گاتے ہیں اور اس کے بعد کبھی کبھی ان کے چار اصحاب کی بھی تعریف کرتے ہیں۔ کبھی شاہِ وقت کا قصیدہ لکھ دیتے ہیں اور کبھی اپنے پیر کا تعارف دیتے ہیں"۔ (ص:۱۵۱-۱۵۲)

راسا کی زبان

جان کوی نعمت خان کی پہلی تصنیف کا مسودہ ۱۶۱۷ء میں مرتب کیا گیا اور آخری کتاب جعفر نامہ ۱۶۶۱ء میں لکھی گئی۔ جان کی زندگی کے پچاس سال تصنیف و تالیف میں گزرے۔ وہ ۷۰ سال تک زندہ رہا۔ جان کے دستیاب مسودہ میں 'بدھی ساگر' سب سے زیادہ ضخیم ہے۔ اس کے بعد قائم راسا ہے۔ قائم راسا کی زبان کے تعلق سے ہندوستانی زبان کے ماہرین نے حتمی رائے سے گریز کیا ہے۔ کسی نے راسا

کی زبان کو 'سورٹھ مارو' بتایا ہے، کسی نے اسے 'مارو گرجر' لکھا ہے، کسی نے مارواڑی اور گجراتی لکھا ہے۔ پرانے زمانے میں راجستھانی اور گجراتی دونوں زبانیں ایک ہی تھیں۔ مغلوں کی حکومت جب ہندوستان میں قائم ہوئی تب ان زبانوں میں دھیرے دھیرے دوری بڑھتی گئی اور آگے چل کر دو صوبوں کی زبانیں الگ الگ طور پر پہچانی جانے لگیں۔ راسا کے مترجم ڈاکٹر رتن لال مشرا نے راسا کی زبان کو پرانی راجستھانی لکھا ہے۔ جو برج بھاشا سے قریب تر ہے۔ جانؔ نے مقامی بولی کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ فارسی کا کم کم استعمال کیا ہے۔ راسا ایک تاریخی منظوم مکالمہ ہے جس میں بہادری کے تذکروں کو اوّلیت دی گئی ہے۔ جنگ کے مناظر بیان کرتے وقت جانؔ کوی جذباتی ہو جاتا ہے۔ اس کا قلم تلوار بن جاتا ہے اور روشنائی کو وہ شہیدوں کے جسم سے بہنے والی لہو کی دھار سمجھنے لگتا ہے۔

پونہ میں مقیم ڈاکٹر دکشت سے جب میں نے قائم راسا کی زبان سے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے 'برج بھاشا' کے طور پر اس کی شناخت بتائی۔

جانؔ کوی کا مذہب

جانؔ کوی مسلمان تھا۔ راسا میں اس نے الف خان کی پیڑی کی ابتدا کرتے ہوئے لکھا ہے:

پہلے اللہ کو یاد کرنا چاہیے، جس نے بہادروں کو پیدا کیا
جنگ میں وہی کامیاب ہوتا ہے جس کی طرف اللہ ہوتا ہے۔
اس کے بعد بہادروں کے سردار محمد کا نام لینا چاہیے جنھوں
نے دھرم کا راستہ سارے سنسار کو دکھلایا۔ جن لوگوں
نے کلمہ پڑھا وہ پار اُتر گئے۔ جن لوگوں نے دل میں دغا رکھا وہ مارے گئے۔

جانؔ کوی کو اپنے چوہان ہونے پر ناز تھا۔ اس کو اس بات کا فخر تھا کہ وہ راجپوت ہے۔ اور اس کے خاندان میں بڑے بڑے بہادر ہوئے ہیں۔ وہ پرتھوی راج چوہان اور ہمیر کی اولاد ہونے پر بھی فخر محسوس کرتا ہے۔

ڈاکٹر مشرا نے لکھا ہے کہ جانؔ کوی کی تخلیقات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سر تاپا ہندو رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ اگر نام معلوم نہ ہوتا تو یہ شناخت ہی نہ ہوتی کہ ان تخلیقات کا خالق کوئی مسلمان ہے۔ یہی بات منی جن وجے نے لکھی ہے۔ لکھتے ہیں:

"اگرچہ ذات اور مذہب سے وہ مسلمان تھا لیکن اس کی تخلیقات کے مطالعے سے معلوم ہوتا

ہے کہ وہ بھاؤ بھگتی کی نگاہ سے ہندو تھا۔ اس کا جسم مسلم تھا، لیکن روح سے وہ ہندو تھا۔ اگر وہ اپنی تخلیقات میں اپنے شخصی تعارف کی تفصیل بیان نہ کرتا تو قارئین اسے ہندو ہی سمجھتے"۔

تعجب ہے کہ مشرا اور مُنی دونوں ہی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نام سے وہ مسلمان رہا ہو لیکن عقیدے اور روح کے اعتبار سے وہ ہندو تھا۔ حالانکہ جانؔ نے متعدد جگہ اللہ اور رسول کا ذکر کیا ہے۔ ان بزرگوں کا ذکر کیا ہے جن کے ہاتھ پر اس نے بیعت کی تھی۔ ہندی کے محققوں اور ناقدوں نے اکبر کی بیوی تاج کو تیری کو بھی ہندو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، بلکہ ایک جگہ تو اسے کرشن بھگت بتایا گیا ہے۔

تاج بی بی

تاج بی بی فتح پور کے پانچویں نواب دیوان فدن خان کی بیٹی تھی۔ دیوان فدن خان ناہر خان کے انتقال کے بعد نواب بنے۔ انھوں نے ۱۵۴۵ء سے ۱۵۵۲ء تک نوابی کے فرائض انجام دیے۔ فدن خان کو دلّی میں اکبر بادشاہ نے طلب کیا اور دربار میں مقام و مرتبہ عطا کر کے شان بڑھائی۔ فدن خان نے اپنی بیٹی تاج بی بی کو اکبر سے بیاہ دیا اور دلّی سے اپنے روابط مستحکم کرلیے۔ تاج بی بی کو شعر و سخن سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ خود بھی شعر کہتی تھی۔ اس کا تخلیقی رجحان مزاح کی جانب تھا۔ مزاح سے بھرپور ان کی ایک تخلیق "بی بی باندی کا جھگڑا" موجود ہے۔ اس کی اطلاع رام پرشاد جی ورما نے اپنی کتاب 'نگر فتح پور نگراں ناگر" کے صفحہ نمبر ۳۹ پر دی ہے۔ تاج بی بی اور اکبر کی شادی کا ذکر کوی جانؔ نے اپنی مشہور کتاب 'قائم خان راسا' میں اس طرح کیا ہے۔ (مفہوم)

"جب دلّی کا بادشاہ اکبر ہوا تو اس نے بھی دیوان فدن خان کو بلا کر بہت آدر سمان دیا۔ وہ رات دن اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ اس طرح فدن خان چوہان کا مان دنیا میں بہت بڑھ گیا۔ فدن خان سے ایک دن باشاہ نے کہا کہ ہمارے اور آپ کے بیچ روابط مستحکم ہونا چاہئیں۔ اس سے میرے دل کی آرزو پوری ہوگی۔ اس طرح فدن خان نے اپنی بیٹی اکبر سے بیاہ دی۔ اب پہلے کا پیار اور بھی بڑھ گیا۔ دونوں اس رشتے سے سکھی ہوئے۔ فدن خان کی اس بیٹی نے آگے چل کر تاج کے نام سے شاعری میں نام کمایا"۔

تاج بی بی کا مقبرہ آج بھی آگرہ میں موجود ہے۔

ڈاکٹر اُدے شنکر شری واستو نے اپنی ہندی کتاب 'مدھیہ یوگین ہندی کے صوفی مسلمان کوی' میں تاج کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے اور بابا فرید سے منسوب اس دوہے کو تاج کی تخلیق بتایا ہے۔

کاگا سب تن کھائیو، چن چن کھائیو ماس
دو نینا مت کھائیو، پیا دیکھن کی آس
صفحہ ۱۴۵

مرنے سے پہلے تاج نے یہ دوہے کہے تھے۔

پریتم بسے پہاڑ پر، ہم جمونا کے تیر
اب کو ملنو کٹھن ہے، پائن پڑی زنجیر
نگر آگرہ میں رہے، گری پر بسے موناتھ
توروں زنجیر جوبھ سوں، میں پریتم کے ساتھ
ص: ۱۴۴

وید پرکاش گرگ نے بھی اپنی کتاب 'ہندی ساہتیہ کا اتہاس' میں بڑی تفصیل سے تاج کا ذکر کیا ہے، انھوں نے تاج کو کرشن بھکت شاعرہ بتایا ہے۔ اور تاج کی زبان کو برج بھاشا لکھا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ ہندی اور برج بھاشا میں کرشن بھکتی کے سلسلے کے جتنے بھی کوی (شاعر) ہوئے ہیں ان میں تاج کا مقام بلند ہے۔ انھوں نے اس پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ تاج کی مکمل اور مستند سوانح حیات ابھی تک اندھیرے میں ہے۔ بس ادھر اُدھر پھیلے ہوئے اوراق سے ہی ہمیں تاج کے تعلق سے معلومات ملتی ہیں۔ تاج کے بارے میں لکھے مضامین کا تذکرہ کرتے ہوئے وید پرکاش گرگ لکھتے ہیں۔ (ترجمہ)

"ادھر تاج کے تعلق سے دو مضامین میرے مطالعے میں آئے۔ پہلا مضمون ۱۰ جنوری ۱۹۵۴ء کے ہفتہ وار ہندوستان میں رام نارائن اگروال نے 'تاج اس کی شاعری اور شخصیت'، دوسرا مضمون برج بھارتی کے ۱۳/ ویں سال کے دوسرے شمارے میں اگرچند جی ناہٹا نے 'تاج کی تحریر کردہ ایک اہم گمنام گرنتھ' (بعد میں تاج کے تعلق سے اور بھی مضامین شائع ہوئے) ان مضامین کی روشنی میں تاج کی اندھیروں میں ڈوبی ہوئی زندگی کے کچھ کچھ خدوخال نمایاں ہوتے ہیں"۔ (ص: ۱۶۱)

گرگ جی نے لکھا ہے کہ تاج کی زندگی کے مطالعے سے یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ اس کی دوستی بیربل کی بیٹی شوبھاوتی سے بہت گہری تھی۔ اس کے علاوہ رائے ورن داس جی کی بیٹی سے بھی ملاقاتیں تھیں۔ اس زمانے میں وٹھل ناتھ کا بیربل سے گھریلو تعلق تھا۔ انہی کی صحبت سے تاج کرشن بھکتی کی نظمیں کہنے لگی تھی۔ ایک بار تاج نے اپنے شوہر اکبر کو قبضہ میں کرنے کیلئے وِٹھل ناتھ جی سے ایک تعویذ بناکر گلے میں ڈال لیا۔ دوسری بیویوں کی شکایت پر جب اکبر نے یہ تعویذ کھلواکر دیکھا تو اس میں ایک دوہا لکھا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر اکبر کے دل میں تاج کی محبت اور بڑھ گئی۔

تاج کا انتقال اکبر کے انتقال کے بعد ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق تاج کا انتقال ۷۰/ سال کی عمر میں ہوا۔ تاج نے نظمیں، دوہے اور دھارمک گیت کثرت سے لکھے ہیں۔ ولبھ سماج کے مندروں میں تاج کی ایک تخلیق 'ساڑھے بارہ دھمار' گائی جاتی ہے۔ تاج ایک زود گو اور گہرے جذبات کی حامل شاعرہ

تھی۔ اس کی شاعری آسان اور دل کو چھو لینے والی ہے۔ میرا کے بعد تاج ہی کا نام آتا ہے۔ گرگ جی نے لکھا ہے کہ گوند گلا بھائی کو تاج کی لکھی ہوئی ایک کتاب ملی تھی۔ جس میں مختلف عنوان سے نظمیں اور گیت شامل تھے۔ ان نظموں کی تعداد دو سو تھی۔ بھائی گووِند جی کے ذاتی کتب خانے میں یہ موجود ہے۔ ڈاکٹر پربھو دیال متل کا خیال ہے کہ تاج کے نام سے دستیاب ساری نظمیں ایک ہی تاج کی نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ ان نظموں کے موضوعات، ان کا آہنگ اور ان کی تخلیق کے زمانے مختلف ہیں۔

تاج کی مشہور کتاب 'بیوی باندی کا جھگڑا' ہندی ادب کے ناقدین کیلئے موضوع بحث رہی ہے۔ اس کتاب میں عام انسانی زندگی کا احوال مزاحیہ پیرایۂ اظہار میں کیا گیا ہے۔ اس لیے اسے ایک سنجیدہ اور بھگتی رس میں ڈوبی شاعرہ کا کلام نہیں کہا جاسکتا۔ بعض کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ تخلیق تاج کی ابتدائی دنوں کی لکھی ہوئی ہے۔ جب وہ بھگتی کے رموز و اسرار سے واقف نہیں تھی۔

ہندی ادب کے معتبر اور مستند اہل قلم نے جب بھی کسی "مسلم ہندی کوی" پر قلم اُٹھایا تو سب سے پہلے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ شعراء تن سے مسلمان تھے لیکن من سے پورے کے پورے ہندو تھے۔ خصوصاً کرشن بھگتی کے سلسلے میں جتنے مسلمان شاعروں نے کرشن جی کی تعریف میں جس انداز سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے اس کے تناظر میں ان سبھی شاعروں کو ظاہری مسلمان اور باطنی ہندو قرار دیا گیا ہے۔ اوّل تو یہ کہ ادب کے ناقد کو مذہبی فتویٰ جاری کرنے کا حق کس نے دیا۔ دوسری بات یہ کہ وہ بے شمار ہندو شاعر جنھوں نے حضرت محمدؐ کی شان مبارک میں اعلیٰ سے اعلیٰ نعت کہنے کی کوشش کی ہے، کیا ہم انھیں تن سے ہندو من سے مسلمان کہنے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ ایک ہندو شاعر دلورام نے تو اپنا تخلص ہی کوثری رکھ لیا تھا۔ کوثری کا یہ شعر کیا انہیں مسلمان سمجھنے کیلئے کافی نہیں ۔

خدا تیرا عاشق، تو عاشق خدا کا　　میں تم دونوں پر ہوں فدا یا محمدؐ

لیکن اس میں کوئی سچائی نہیں۔ دلورام ہندو تھے اور ہندو رہے بلکہ نعت میں بھی وہ اپنے ہندو ہونے کا صاف اعلان کرتے ہیں ۔

لے کے دلورام کو حضرتؐ گئے جنت میں جب　　غل ہوا ہندو بھی محبوب خدا کے ساتھ ہے

دلورام کی نعتیہ شاعری اسی لیے اہمیت کی حامل ہے کہ وہ ہندو تھے۔ اسی طرح مسلم شاعروں کے بارے میں یہی رائے قائم کی جائے کہ وہ مسلمان تھے۔ اس کے بعد بھی ہندو دیوی دیوتاؤں کے لیے اپنی شاعری میں عقیدت اور محبت کا اظہار کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ (بعد کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ دلورام کوثری مسلمان ہوگئے تھے۔)

فتح پور کے شیخاوت حکمراں

۲۸۰ر سال کی نوابوں کی حکمرانی کو جب زوال ہوا تو راجستھان کے شیخاوت خاندان نے اس کی باگ ڈور سنبھالی۔ اور ۱۷۳۱ء میں راو شری شیو سنگھ پہلے حکمراں ہوئے۔ انھوں نے سترہ سال حکمرانی کے فرائض انجام دیے۔ ۱۷۴۸ء میں راؤ شری سمرتھ سنگھ نے اقتدار سنبھالا جو چھ سال تک قائم رہا۔ اس کے بعد راؤ شری ناہر سنگھ حکمراں ہوئے۔ ان کا زمانہ ۱۷۵۴ء سے ۱۷۵۶ء تک رہا۔ بعد ازاں راؤ شری چاند سنگھ تخت نشین ہوئے اور ۱۷۶۳ء تک بر سرِ اقتدار رہے۔ ۱۷۹۵ء تک راؤ شری دیوی سنگھ نے راج کیا۔ راؤ شری لچھمن سنگھ کا زمانہ ۱۷۹۵ء سے ۱۸۳۳ء تک رہا۔ راؤ رام پرتاپ سنگھ نے ۱۸۳۳ء سے ۱۸۵۰ء تک حکومت کی۔ ۱۸۵۱ء میں راؤ شری بھیرو سنگھ نے ذمہ داری سنبھالی اور اس کے بعد ۱۸۶۶ء سے ۱۹۲۲ء تک راؤ شری مادھو سنگھ نے پورے ۵۶ر سال تک فتح پور پر راج کیا۔ ان کے بعد آخری حکمراں کلیان سنگھ جی نے ۱۹۴۷ء تک حکومت کی۔ نوابوں کی طرح شیخاوت حکمراں بھی غیر متعصب تھے۔ عوام کے ساتھ سبھی نے یکساں اور بہتر سلوک کیا۔ شیخاوتوں نے ۲۱۶ سال تک فتحپور کی گدی پر راج کیا۔ کُل دس حکمراں ہوئے۔

'نگر فتح پور نگراں ناگر' کے مصنف جناب رام گوپال ورما نے اپنی مذکورہ کتاب میں لکھا ہے، جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے:

"شیخاوت راجپوتوں کی ابتدا شیخاجی سے ہوئی ہے۔ یہ شیخاجی کون ہیں؟ یہ کچھواہ خاندان کے ۱۴ر ویں بزرگ نرسنگھ جی کے چھوٹے بھائی بالاجی کے بیٹے تھے۔ جو ایک مسلم فقیر شیخ برہان کی دعا سے پیدا ہوئے تھے۔ شیخ برہان تیمور لنگ کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کیلئے ہندوستان آئے تھے"۔ (ص:۴۸)

حاجی نجم الدین کے وصال کے بعد ان کے فرزند مولانا نصیر الدین نے جب درگاہ بنانے کا ارادہ کیا تو راؤ شری مادھو سنگھ جی نے ان کا بڑا تعاون کیا۔ درگاہ کے لیے گیارہ بیگہ زمین وقف کی اور نوابوں کے زمانے میں بنا ہوا کنواں بھی دیا۔

شیخاوت حکمرانوں نے اگرچہ شہر کو خوبصورت بنانے کیلئے کوئی کارہائے نمایاں انجام نہیں دیا، البتہ نوابوں کے بنائے محلوں اور دیگر عمارتوں کا تحفظ ضرور کیا۔

انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑنے والوں میں فتح پور کے عوام پیش پیش رہے۔ مشہور

سیاسی رہنما رام منوہر لوہیا کا آبائی وطن یہی فتح پور ہے۔

دادو دوارے کے سنتوں کا سلسلہ ایک طویل عرصے تک یہاں جاری رہا۔ اس سلسلے کے سنت شاعر سندر داس جی اور سنت داس جی مارو کی سمادھیاں آج بھی یہاں موجود ہیں۔ یہ سمادھیاں نوابوں کی تعمیر کردہ ہیں۔

فتح پور...... مسجدوں کا شہر
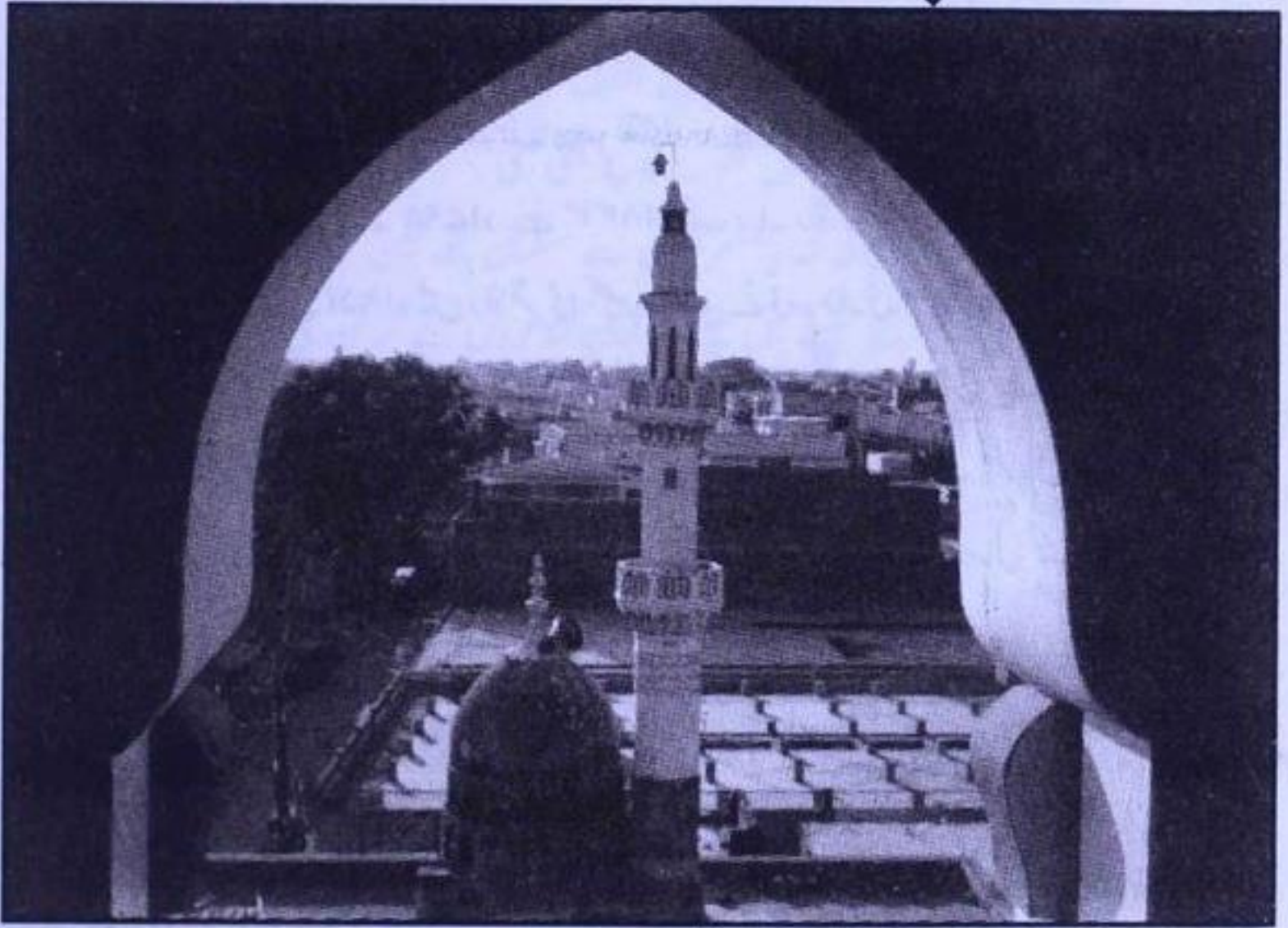
مسجد درِ دولت بازار فتح پور کا اوپر سے خوبصورت منظر

فتح پور شہر اگرچہ مسلم نوابین کا بسایا ہوا ہے۔ ۱۲؍ نوابوں نے بالترتیب ۲۸۰؍ سال تک یہاں کے عوام کے دلوں پر حکومت کی۔ اس کے باوجود نوابوں نے مسجدیں کم بنائیں اور مندر کثرت سے بنائے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اِن نوابوں کی بیگمات عام طور پر ہندو ہوا کرتی تھیں لہٰذا ان کی پوجا پاٹھ کے لیے نوابوں نے مندروں کی تعمیر کا خصوصی اہتمام کیا۔ اس کے علاوہ یہ نوابین مذہبی معاملات میں شدت پسند نہیں تھے۔ رعایا کو مکمل اختیار تھا کہ وہ اپنے اپنے طور پر اپنے اپنے مذاہب کا آزادی کے ساتھ پالن کر سکتے ہیں۔

"واقعات قوم قائم خانی" میں فتح پور کے گڑھ کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے اس میں ایک مسجد بھی دِکھائی گئی ہے۔ یہی سرزمین فتح پور پر پہلی مسجد تسلیم کی جانی چاہیے۔ مفاد پرستوں نے جس طرح فتح پور کے قلعے کو ریزہ ریزہ کر کے فروخت کیا ہے وہیں قلعے کے صحن سے مسجد کا نشان بھی مٹا دیا ہے۔ تاریخی واقعات کے تناظر میں دیکھا جائے تو فتح پور کے تیسرے نواب دولت خان کے زمانے میں بابر قلندر کی آمد پر شہر کے مغربی کنارے پر ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی۔ اسے اس شہر کی دوسری مسجد کہا جا سکتا ہے۔

تیسری مسجد نواب درِ دولت خان کے مزار کے سامنے موجود تھی۔ یہ مسجد میں نے اپنے بچپن میں دیکھی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس مسجد پر چھت نہیں تھی۔ مسجد کا رقبہ بھی بہت ہی چھوٹا تھا۔ آج اسی مسجد کی جگہ ایک عالی شان مسجد تعمیر ہو چکی ہے جو مسجد نواب درِ دولت کے نام سے مشہور ہے۔ رقبے کے لحاظ سے اس مسجد کے داخلی دروازے پر تعمیر کیا گیا منارہ فتح پور کے تمام مناروں میں سب سے بڑا ہے۔ اس منارے کی آخری منزل پر جانے کے بعد پورا شہر سمٹ کر ناظرین کی آنکھوں میں سما جاتا ہے۔

اس کے بعد تاریخ کی کتابوں میں فتح پور کی سنکوی گلی کی مسجد کا ذکر ملتا ہے۔ یہی وہ مسجد ہے جہاں آفتابِ شیخاواٹی خواجہ نجم الدین چشتیؒ نے پہلی بار قیام کیا تھا۔

ایک سروے کے مطابق آج یہاں پینتالیس کے قریب مساجد موجود ہیں۔ جن میں اکثریت ان مساجد کی ہیں جو آزادی کے بعد تعمیر ہوئی ہیں۔

آزادی سے قبل محلہ بیوپاران میں دو مسجدیں تھیں۔ بڑی مسجد اور چھوٹی مسجد۔ پچھلے پچیس سال میں یہاں غیر معمولی طور پر مساجد کا اضافہ ہوا ہے۔ تمام مساجد کو صحابہ کرام کے اسمائے گرامی سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ مسجد ابو بکر، مسجد عمر، مسجد عثمان، مسجد بلال، مسجد فاطمہ، مسجد ابو حنیفہ، کویتی مسجد، بھولے پیر کی درگاہ کے پاس قدیم مسجد، مسجد عثمانیہ کے نام سے موجود ہیں۔ مومن پورہ میں مدینہ مسجد ہے۔

محلّہ زمینداران میں سو سال قبل ایک مسجد "مسجد زمینداران" کے نام سے تعمیر ہوئی تھی۔ سو سال بعد اس کی جدید تعمیر کا کام شروع ہوا ہے۔ اسی محلّے میں آگے چل کر 'مسجد بساتیان' واقع ہے۔ یہ مسجد ایک عمارت کی پہلی منزل پر ہے۔ یہاں 'اہلِ حدیث' کا مصلیٰ ہے۔ اس لیے عام مسلمان اس مسجد میں کم آتے ہیں۔ شہر کی حدیں جہاں ختم ہوتی ہیں وہاں سے قبرستان شروع ہوتے ہیں۔ دونوں کے درمیان صرف نماز جنازہ کی ادائیگی کیلئے ایک بڑے قطعہ زمین پر "قلندری مسجد" فتح پور کی جوڑ برادری نے بنائی تھی۔ جو عام مسلمانوں کے لیے وقف تھی۔ یہاں ایک کنواں بھی "بہادر خاں والا کنواں" کے نام سے بنایا گیا تھا جو آج بھی موجود ہے۔ قلندری مسجد ہی کی زمین میں اب ایک عالیشان مسجد نماز کیلئے

بنائی گئی ہے۔ سو سال بعد محلہ زمینداران کی جانب سے یہ پہلی مسجد بنی ہے۔ عید گاہ کے قبلے کی جانب کسی زمانے میں ایک کنواں ہوا کرتا تھا۔ اسے ہموار کر کے ایک خوبصورت مسجد 'مدنی مسجد' کے نام سے برسوں پہلے عالم وجود میں آچکی ہے۔ مسجد کے سامنے ایک مدرسہ بھی ہے۔ اسی راستے پر بیکانیر ہائی وے کی طرف ایک چھوٹی سی مسجد "مکی مسجد" کے نام سے موجود ہے۔ باوڑی گیٹ پر ایک پرانی مسجد مریدان کے نام سے مشہور ہے۔ ایک بہت چھوٹی سی پرانی مسجد مٹرومل باجوریا کی کوٹھی کے عقب میں محلہ سناران میں موجود ہے۔ جسے بعض لوگ ملو شاہ کی مسجد کہتے ہیں۔ بعض لوگ اسے "مسجد دیوڑان" کے نام سے جانتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں مسلم دیوڑا برادری کی بستی تھی۔ اب تمام دیوڑے درگاہ حاجی نجم الدین اور قلندری مسجد کی جانب جانے والے راستوں پر آباد ہوگئے ہیں۔ چھتریا بس اسٹینڈ کے راستے پر حال ہی میں ایک مسجد اور مدرسہ تعمیر ہوئے ہیں۔ جو 'مسجد تیلیان' کے نام سے موسوم ہے۔ تیلیوں کے بڑے محلّہ میں جامع الفردوس، قدیمی مسجد، مسجدِ اقصیٰ موجود ہیں۔ ریلوے اسٹیشن کے راستے پر مغلوں کی مسجد، قاضیوں کی کوٹھی کے سامنے ایک مسجد، محلّہ لوہاران میں جمال الدین مسجد، محلّہ بیوپاریان میں آزاد اسکول کے پاس بلال مسجد، محلّہ دھوبیان میں مرحوم حاجی وزیر نے برسوں پہلے 'مسجد حاجی وزیر' بنائی تھی، اب اس محلّہ میں مسجد رحمانیہ، مسجد شیخان، مسجد غریب نواز کا اضافہ ہوا ہے۔ یہاں ایک بڑا مدرسہ بھی ہے۔

درگاہ حاجی نجم الدین میں دو مسجدیں ہیں۔ جن میں سے ایک جامع مسجد ہے۔ چھوٹی مسجد درگاہ کے دیوان خانے کے ساتھ ہی تعمیر ہوئی تھی جس میں صرف ایک صف ہوتی ہے۔ یہ فتح پور کی سب سے چھوٹی مسجد ہے۔ ایک مسجد محلّہ چیجاران میں وسیع پیمانے پر بنائی گئی ہے۔ بازار سے قریب پہلے محلّہ شیشگران میں ایک چھوٹی سی مسجد جو قدیم فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھی، اسے شہید کر کے مسجد 'عائشہ صدیقہ' کے نام سے ایک بڑی مسجد پچاس لاکھ روپے کی لاگت سے بنائی ہے۔ یہ مسجد جدید تعمیرات کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے یہاں شیشگران برادری موجود تھی، مگر اب اس برادری کا کوئی بھی گھر یہاں موجود نہیں بلکہ اب یہاں چھیپا، نیلگر، بساطی اور بیوپاری جیسی برادریاں آباد ہیں۔ محلّہ قاضیان میں تقریباً سو سال پرانی ایک مسجد آج بھی موجود ہے۔ مسجد کا بلند مینارہ ایک خوشنما اور ایمان پروَر منظر کا مظہر ہے۔ فتح پور کی متعدد مساجد کی تعمیر میں جناب نثار احمد راہی نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر فن تعمیر کے اعلیٰ نمونے پیش کرنے میں اپنی بے لوث خدمت صرف کی ہے۔ بالخصوص مسجد دیہ دولت اور مسجد عائشہ صدیقہ کا کام راہی صاحب ہی کی نگرانی میں انجام پایا ہے۔

❁❁❁

فتح پور ...... کنوؤں کا شہر
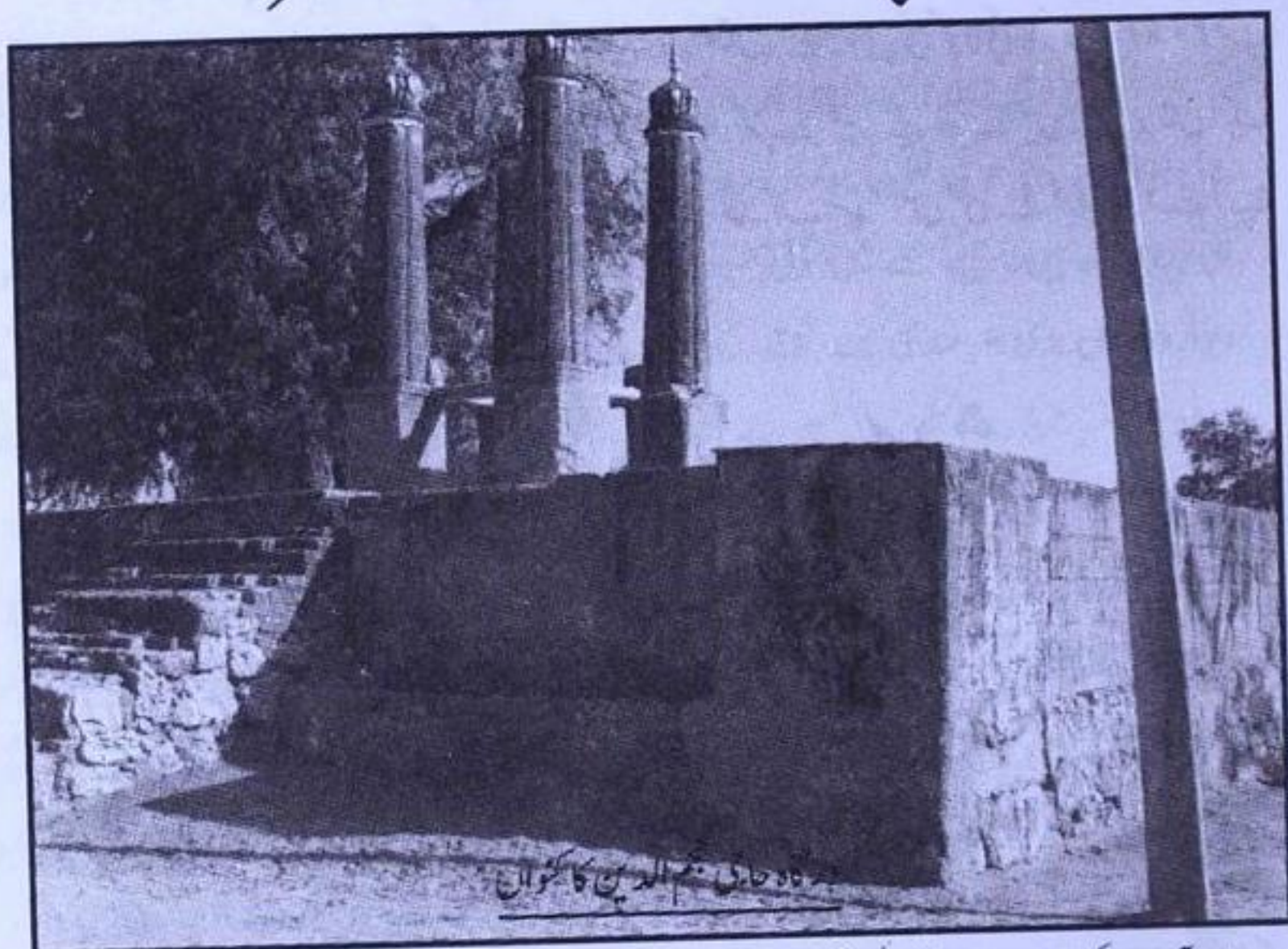
درگاہ حاجی نجم الدین کا کنواں

یاد آیا وہ کنواں پیاس بجھائی جس نے
سایہ میں بیٹھے تھے جس کی وہ شجر آیا

کسی زمانے میں فتح پور کنوؤں کا شہر کہلاتا تھا۔ فتح پور کے تقریباً دو درجن کنویں نوابوں کے دَور میں بنے تھے۔ فتح پور کے نوابوں نے مسجدیں کم، مندر اور کنویں زیادہ بنائے۔ کچھ کنویں تو اس قدر مشہور ہوئے کہ ان کے نام پتوں میں دیے جانے لگے۔ مثلاً جادو کا کنواں، چوہانوں کا کنواں، چیتی کا کنواں، مہا سنگھ کا کنواں، راٹھور کا کنواں، درگاہ کا کنواں، بڑا کنواں، شیخ کا کنواں، سراوگیوں کا کنواں، پنجرہ پول کا کنواں، دھوبیوں کا کنواں، بہوگن کا کنواں، رانی ستی کا کنواں، نیوٹیوں کا کنواں، چیجاروں کا کنواں، دولت خان کا کنواں، بی بی کا کنواں وغیرہ۔

بہت سے کنوؤں پر کتبے نصب تھے۔ ان کی عبارتوں سے کنوؤں کی تعمیر و تکمیل کی تاریخ اور زمانہ معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً جادو کا کنواں کے کتبے میں ایک سطر میں درج ہے "دلّی پتی سہہ اورنگ" یعنی دلّی پر اس وقت اورنگ زیب کی حکومت تھی۔ اس کتبے کی تحریر سے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ فتح پور میں اس وقت نواب الف خان کے تیسرے فرزند دیوان طاہر خان کی حکومت تھی۔ حالانکہ جن بارہ نوابوں نے فتح پور پر ۲۷۹ سال تک نوابی کی ہے ان میں طاہر خان کا نام شامل نہیں ہے۔

سیّد قاسم علی کا کنواں

بسوا روڈ پر دار العلوم سلطان الہند کے قریب سیّد حسن علی کا کرشی فارم ہے۔ اس میں ایک کنواں سو (۱۰۰) سال پرانا ہے۔ یہ کنواں عام کنوؤں سے مختلف ہے۔ اس کی گولائی کا رقبہ ۲۰ × ۲۰ فٹ ہے۔ گہرائی ڈھائی سو فٹ ہے۔ کنویں کے احاطے میں چار کمرے تعمیر کیے ہوئے ہیں۔ برابر میں ایک چبوترا ۴۰ × ۵۰ فٹ کا ہے۔ پہلے اس کنویں کا کچھ اور نام تھا۔ اب سیّد حسن علی نے خرید کر اسے اپنے والد سیّد قاسم علی کا نام دیا ہے۔

فتح پور...... حویلیوں کا شہر

اُترا چاند حویلی پر نظروں کو اشنان ملا

فتح پور کی تاریخ اور تعریف میں اگر حویلیوں کا ذکر نہ آئے تو نہ تاریخ مکمل ہو گی نہ تعریف۔ فتحپور میں پرانی حویلیوں کا آج بھی ایک جال بچھا ہے۔ یہ تمام حویلیاں سیٹھ ساہوکاروں اور بنیوں کی بنائی ہوئی ہیں۔ یہ حویلیاں اس وقت بنی تھیں جب جدید تعمیراتی لوازمات کا زمانہ نہیں تھا۔ اس وقت سمنٹ کانکریٹ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایسے حالات میں ایسی وسیع و عریض اور بلند و بالا حویلیوں کی تعمیر کو ایک حیرت انگیز کارنامہ ہی کہا جائے گا۔ ان حویلیوں میں بھینتی چتر کلا (دیواروں پر رنگ سے بنائی تصویر) کی بڑی اہمیت ہے۔ ان تصویروں میں رنگوں کا امتزاج جہاں مصوروں کے فن کی داد چاہتا ہے وہاں اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ معاشرے کی رمق آج بھی ان تصویروں میں دِکھائی دیتی ہے۔ یہ کام کل بھی بے مثال تھا، آج بھی بے مثال ہے حالانکہ اب دیواروں سے پلستر جھڑنے لگا ہے، رنگ بھی ماند پڑنے لگے ہیں، اس کے باوجود سیاحوں کی دلچسپی جوں کی توں برقرار ہے۔ بیرونی ممالک کے لوگ آج بھی اپنے کیمروں کے ساتھ ان حویلیوں کی دیواروں پر چمکتے رنگوں میں کچھ نہ کچھ کھوجتے رہتے ہیں۔

فتح پور کی حویلیوں پر رنگ و روغن کے عکس اُبھارنے والے کلاکاروں میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ انھوں نے اپنے ہنر کو 'روزی روٹی' سے جوڑنے کے لیے دیواروں کو رنگوں کا لباس عطا کیا۔ اس وقت اگرچہ ہنر مندوں کو پختہ گھر میسّر نہیں تھے لیکن وہ لوگ بھوکے بھی نہیں رہے۔ محنت کی، عزت کی روٹی کھائی، بچوں کی پرورش کی اور کچے گھروں میں بھی سکھ کی نیند سوئے۔

خانجی کی حویلی

فتح پور میں محلہ زمینداران میں واقع صرف خانجی کی حویلی ہی واحد حویلی ہے جو کسی مسلمان کی بنائی ہوئی ہے۔ یہ حویلی تقریباً سو سال پرانی ہے۔ اس حویلی کے تین حصے ہیں۔ تین دالان ہیں اور تین ہی دروازے ہیں۔ پہلے حصے میں پہلی منزل پر ایک شیش محل موجود ہے۔ یہ کمرہ جس کی چھت اور دیواروں میں بڑی ہنر مندی سے شیشے کے ٹکڑے چسپاں کیے گئے ہیں۔ یہ شیش محل اگرچہ فتح پور کی حویلیوں کا سرتاج ہے، لیکن یہ تشہیر سے محروم رہا۔ اس لیے سیاحوں کو اس کی موجودگی کا علم نہ ہو سکا۔ اسی حصے میں ایک سادہ چھوٹا سا کمرہ ہے جسے مسجد محل کہتے ہیں۔ یہ کمرہ عام استعمال کے لیے نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ اس میں کسی جن کا مسکن ہے۔ اسی لیے اسے مسجد محل کا نام دے کر مقفل کر دیا گیا ہے۔ حویلی کا یہ پہلا حصہ پونہ میں مقیم جناب مرحوم حسین خان علی خان جوڈ نے ۴۵ر سال قبل خرید لیا تھا۔ درمیانی حصہ جناب بھورے خان بنیس کے خاندان کی تحویل میں ہے۔ آخری حصہ جو امام باڑے کی طرف ہے، مرحوم حاجی اصغر مولے خان بھوان نے برسوں پہلے خرید لیا تھا جس میں ان کا خاندان آباد ہے۔
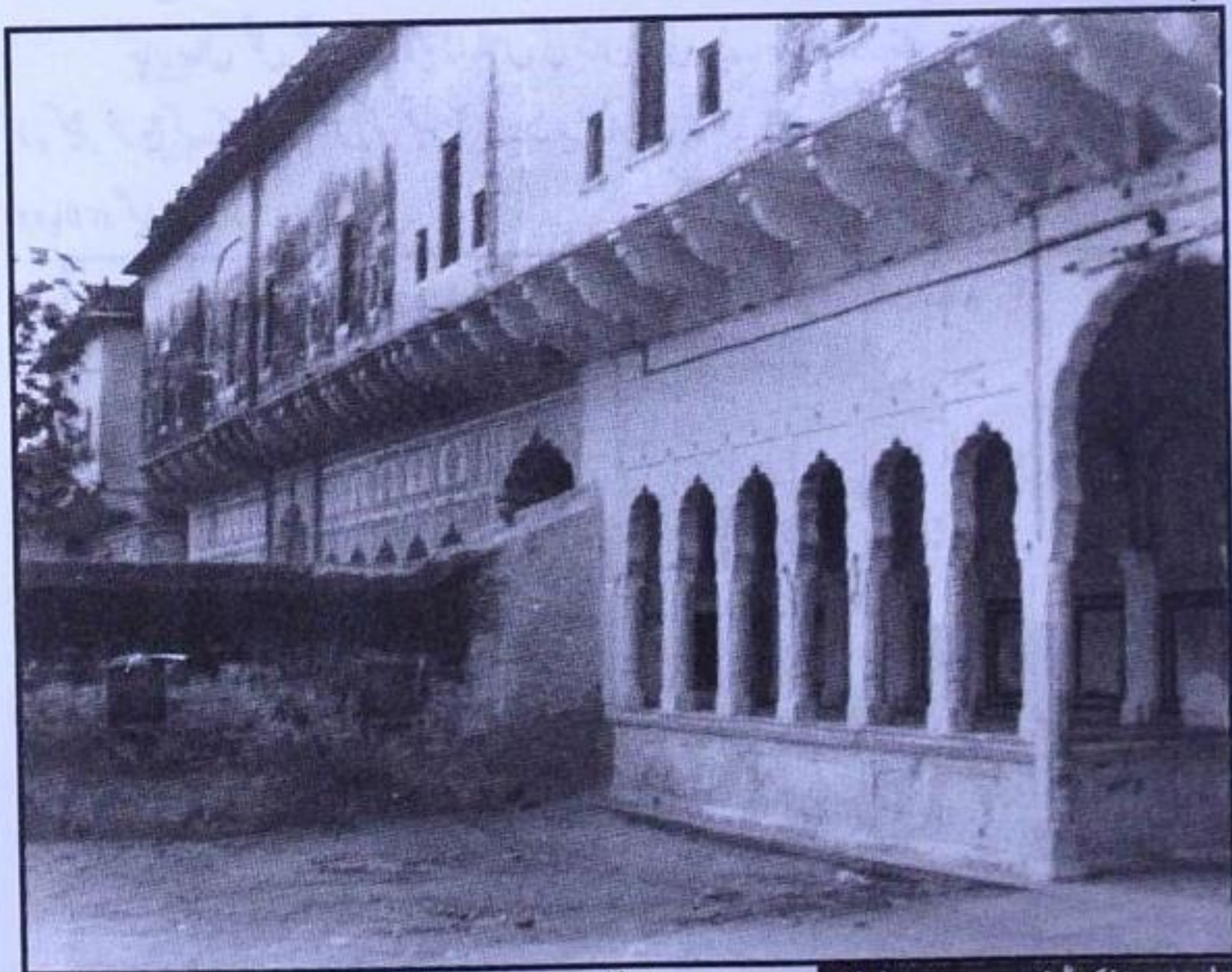
جدید طرزِ تعمیر کے نمونے

پچھلے پچیس تیس سال سے باشندگانِ فتح پور پرانی طرز کی حویلیوں کو نظرانداز کر کے جدید طرزِ تعمیر کو پسند کرنے لگے ہیں۔ محلّہ بیوپاریان میں اب بہت کم گھر ایسے ہیں جن کو پرانا کہا جاسکتا ہے۔ چونکہ یہاں کے لوگوں کی اکثریت کویت میں برسرروزگار ہیں اس لیے اس محلّہ میں زرِ کثیر کی ریل پیل ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عموماً لوگ جدید، پختہ، وسیع اور بلند کوٹھیاں تعمیر کر رہے ہیں۔ ہر گھر کا اپنا ایک رنگ ہے، ایک اندازِ تعمیر ہے۔

محلّہ سبزی فروشان میں پچھلے دس برسوں میں جو عمارتیں وجود میں آئی ہیں ان کو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔

محلّہ زمینداران میں بھی قابلِ دید مکانات ایستادہ ہیں۔ خصوصاً شوکت غنی خان چوہان (شوکت جذبی) کی جدید کوٹھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس محلّہ میں یہ سب سے بلند عمارت ہے۔ دبئی کی طرزِ تعمیر پر اس کوٹھی کو تعمیر کیا گیا ہے۔ رام دیورے کے برابر دیوڑان برادری کے مکانات بھی قابلِ دید ہیں۔ اصغر محمد خان ٹھیکیدار کا بنگلہ بھی خوبصورتی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے۔

چار سال قبل تعمیر شدہ دیوڑا ہاؤس کی شان نرالی ہے۔ حاجی منور خان دیوڑا کے فرزندوں نے زرِ کثیر خرچ کر کے اس ہاؤس کو تعمیر کیا ہے۔ یہ عمارت چونکہ کھلے میدان میں ہے اس لیے اس کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔

چیدہ چیدہ

چیدہ چیدہ

کچھ اور نوابوں کے بارے میں

فتح پور کے نوابوں میں جہاں ایک طرف بہادر اور بے پناہ جنگجوئیت کے مالک ہوئے ہیں، وہاں دوسری طرف شعر و سخن کے رسیہ، قرطاس و قلم کے دھنی اور بے پناہ فہم و فراست کے حامل بھی ہوئے ہیں۔ نواب در دولت خان جہاں ایک صاحب حال و قال بزرگ تھے وہاں ان کے پانچ مقولے بھی مشہور تھے۔ جو فخر التواریخ کے صفحہ نمبر ۵ پر درج ہیں:

(۱) خدا کو جو خالق جملہ مخلوق کا ہے ایک اور لا شریک لہٗ سمجھنا چاہیے۔ اس کا کوئی ہمسر اور حصہ دار نہیں ہے۔ (۲) سوائے خدا کے دوسرے سے کبھی نہیں ڈرنا چاہیے۔ اگرچہ دشمن کتنے قوی اور کثیر ہوں۔ (۳) بوقتِ انصاف دوست اور دشمن کو برابر اور ایک آنکھ سے دیکھنا چاہیے۔ (۴) اللہ کی عبادت ہر انسان پر لازمی ہے۔ جز اس وحدہٗ لا شریک کے دوسرا کوئی لائقِ عبادت نہیں۔ (۵) دنیا کو ہمیشہ فانی سمجھنا چاہیے۔ (محبوب علی خان نے تین مقولے بتائے ہیں۔)

فتح پور کے ساتویں نواب الف خان کی بہادری اور جواں مردی کی داستانیں تاریخی حوالوں کا ایک ایسا روشن باب ہے جس کی چمک دمک آج بھی یومِ اوّل ہی کی طرح قائم و دائم ہے۔ لیکن کم لوگ جانتے ہیں کہ فتح پور کا یہ بہادر نواب تلوار کے ساتھ قلم کا بھی سپاہی تھا۔ اس کے تخلیق کردہ چار مخطوطوں کی نشان دہی راسا کے ناقد دسرتھ شرمانے کی ہے: (۱) رتناولی۔ (۲) سونتی ست۔ (۳) مدن ونود۔ (۴) کوی ولبھ۔

جب پہلی بار قائم راسا کا مخطوطہ دستیاب ہوا تب اسے الف خاں ہی کی تخلیق کے طور پر شناخت کیا گیا لیکن بعد کی تحقیق سے یہ انکشاف ہوا کہ قائم راسا کے خالق نواب الف خاں کے فرزند دوئم نعمت خان ہیں۔ جو جانؔ کوی کے نام سے مشہور ہوئے۔

فتح پور کے پانچویں نواب فدن خان کی بیٹی تاج جو اکبر کی منکوحہ تھی، اس نے بھی شاعری میں بڑا نام کمایا۔ ہندی گرنتھوں میں جگہ جگہ تاج کے حوالے موجود ہیں۔

فتح پور کا آٹھواں نواب دولت خاں ثانی اپنے والد الف خاں کی طرح بہادر تھا اور قرطاس و قلم کا مالک بھی تھا۔ یہ جان کوی کا بڑا بھائی تھا۔ اس نے بھی کانگڑا کے پہاڑیوں سے جنگ کی اور دتی تخت کے حق میں اپنی وفاداری کا ثبوت دیا۔ یہ عالم تھا، شاعر تھا، اچھا نثار تھا۔ فنونِ لطیفہ کا شیدائی تھا۔

سردار خان ثانی ایک حسن پرست اور عاشق مزاج نواب تھا۔ وہ ایک تیلن کی زلفِ گیرہ گیر کا قیدی ہو گیا تھا۔ اس تیلن کی یاد میں اس نے قلعہ میں ایک ''تیلن محل'' بھی تعمیر کرایا تھا۔

نواب چہارم ناہر خان نے بھی ''بیگم پھول'' کی یاد میں ''پھول محل'' بنایا تھا۔

فخر التواریخ

فخر التواریخ ۱۹۰۰ء میں آفتابِ شیخاواٹی حضرت خواجہ نجم الدین چشتیؒ کے فرزند مولانا محمد رمضان نے لکھی تھی۔ اس کتاب کی ابتدا میں نوابوں کی مختصر روداد ہے۔ فتح پور کے تاریخی مقام کا حوالہ ہے۔ فتح پور کے ہندو سیٹھوں کی تفصیل، ان کی تجارت کا احوال اور مقدس مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کے بعد آفتابِ شیخاواٹی کی روحانی زندگی کے واقعات، کرامت اور زہد و تقویٰ کا ذکر ہے۔ یہ کتاب تاریخ اور سوانح نگاری کا مرقع ہے۔ سو سال پہلے کے فتح پور کی لفظی تصویر اس کتاب میں دِکھائی دیتی ہے۔

پاکستان میں فتح پور کا تذکرہ

پاکستان کے میجر جنرل محمد بشیر خان کی پیدائش ۵ر جولائی ۱۹۲۲ء میں جے پور کے اڑاوتا گاؤں میں ہوئی تھی۔ ۱۹۹۴ء میں ظہیر انور سوئیڈن والا سے ان کی ملاقات ہوئی تو ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا: ''میرا تعلق قائم خانی گھرانے سے ہے۔ ہمارے ایک بزرگ جناب الف خان فتح پور ریاست کے نواب تھے اور مغل شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں اہم قومی عہدے پر فائز تھے۔ کوٹہ بوندی کے قریب کانگڑہ کا قلعہ ہے۔ یہ قلعہ مغلوں کی کوششوں کے باوجود فتح نہیں ہو سکا تھا۔ جناب الف خان کو اسے فتح کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی اور انھوں نے اسے فتح کیا۔ اس کا ذکر خود شہنشاہ جہانگیر نے اپنی کتاب تزک جہانگیری میں کیا ہے۔

(مطبوعہ: راجستھانی زبان ۱۹۹۴ء، مرتبہ عبدالحفیظ باحلیم۔ صفحہ: ۱۳۶۔ کراچی، پاکستان)

آستانہ درِ دولت خان

نواب درِ دولت خان کے آستانے کے بیرونی دروازے پر ایک بورڈ آویزاں ہے جس پر یہ عبادت درج ہے:

حقیقت کی خبر دینے بشیر آیا نذیر آیا   شہنشاہی نے جس کے پاؤں چومے وہ فقیر آیا

آستانہ نجم الملک فاتحِ دوراں

نواب شاہ درِ دولت خاںؒ

ریاست فتح پور شیخاواٹی

بندہ معنی از درِ دولت بدارد نسبتے

بندہ پرور از کرم نسبت پذیرِ ما توئی

فتح پور کی آبادی

فخر التواریخ سو سال قبل لکھی گئی تھی۔ اس وقت ۱۹۰۱ء میں جب مردم شماری ہوئی تو فتح پور کی کل آبادی میں دو ہزار ایک سو اناسی (۲۱۷۹) گھر تھے اور رعایا کی تعداد سولہ ہزار تین سو ترانو (۱۶۳۹۳) تھی۔ ۲۰۰۱ء تک کی مردم شماری کے حساب سے کُل آبادی ۸,۷۷,۴۱ سے تجاوز کر چکی ہے۔ شہر پھیلتے پھیلتے قرب و جوار کے دیہی علاقوں کو اپنے اندر جذب کر چکا ہے۔

موسم اور فصلیں

زمینوں کی ترقی اور خوشحالی کا انحصار ان کے موسموں پر بھی ہوتا ہے ۔

موسم سے لے لیا کرو تحریکِ آگہی   پیڑوں کے نیچے بیٹھ کے غزلیں کہا کرو

موسم اگر معتدل ہو تو زمین، زمین پر بسنے والے، چرند، پرند حتیٰ کہ ہوا اور فضا میں بھی اعتدال موجود رہتا ہے۔ چونکہ شیخاواٹی ریگستانی علاقہ ہے، یہاں موسم عموماً غیر معتدل ہی رہتے ہیں۔ موسم باراں میں بادلوں کی راہ تکتے تکتے بوڑھے کسانوں کی گردنیں دُکھ جاتی ہیں۔ بارش یہاں ہر سال کم ہوتی ہے۔ اس لیے یہاں کے باشندوں کو قحط کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن بھکمری عام نہیں ہے۔ سردیوں میں یہاں کڑاکے کی سردی جسموں کو یخ بستہ کرنے کی طاقت اور صلاحیت رکھتی ہے۔ شدید سردی کے زمانے میں

گھڑوں میں پانی جم جاتا ہے۔ آپ رضائی کے بغیر یہاں سردی کو مات نہیں دے سکتے۔ موسم گرما کے بھی یہی تیور ہوتے ہیں۔ اِدھر بجلی گئی کہ اُدھر آپ پر قیامت ٹوٹی۔ پسینے میں شرابور جسموں کو لیے لوگ اپنے کاروبار میں لگے رہتے ہیں۔ ریگستان کے باوجود یہاں کی زمین زیادہ بارش برداشت نہیں کر سکتی۔ کبھی کبھی جب موسلادھار بارش ہوتی ہے تو کچے مکان ڈھنسنے لگتے ہیں۔ بستیوں میں پانی بھر جاتا ہے۔ فصلیں سر بریدہ فوج کی طرح زمین پر بچھ جاتی ہیں اور کسانوں کی روشن آنکھوں کو بجھا کر رکھ دیتی ہیں۔

پہلے یہاں کی زمین یک فصلہ تھی، صرف بارش میں یہاں باجرہ، مونگ، مونٹھ اور گوار کی فصل ہوتی تھی۔ اب کھیتوں میں کنویں بن جانے سے دوسری فصلیں بھی ہونے لگی ہیں۔

سبزیوں میں ہر قسم کی سبزی پیدا ہوتی ہے۔ گاجر، مولی، گوبھی، ہری مرچی، بیگن، ٹماٹر، دھنیہ، پودینا، ککڑی، ترئی، خربوزہ، تربوز...... ہر حال اور ہر موسم میں دستیاب ہیں۔ انگور، آم، سیب باہر سے آتے ہیں۔

کاروبار

کارخانے اور فیکٹری نام کی کوئی چیز یہاں نہیں۔ چھوٹے چھوٹے اُدیوگ دھندوں کا بھی کوئی سلسلہ نہیں۔ البتہ جولاہے، نیلگر، چھپنا سیسگران، معمار، دھوبی، تیلی، نائی...... آج بھی اپنا آبائی دھندا کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد گھٹ کر ۲۵ / فیصد ہو چکی ہے۔ عموماً یہاں کے باشندے کویت، قطر، دوبئ، بحرین اور سعودیہ عربیہ میں ملازمت کرتے ہیں۔ پہلے مسلمانوں میں عام خوشحالی نہیں تھی۔ لیکن اب کچے گھروں اور گھاس پھونس کے چھپروں سے نکل کر لوگ عالیشان عمارتوں اور پختہ گھروں کے مالک بن گئے ہیں۔ بازاروں اور شادی بیاہ کی تقریبوں میں ہی نہیں بلکہ عام زندگی میں بھی خوشحالی اور خوش پوشی کے نظارے دِکھائی دیتے ہیں۔

سواریاں

پہلے نوابوں اور پھر راجپوتوں کے زمانے میں ہاتھی، اونٹ اور گھوڑوں کی سواریاں ہوتی تھیں۔ اونٹ گاڑیوں اور تانگوں کا رواج عام تھا۔ آزادی کے بعد ہاتھی اور گھوڑے تو منظر نامے سے غائب ہوگئے۔ اونٹ گاڑی اور گھوڑے تانگوں کی سواریوں کا استعمال ایک عرصہ تک ہوتا رہا۔ آج بھی ہے لیکن قلب شہر اب تانگوں کی جگہ آٹو رکشہ والوں نے قبضہ کرلیا۔ بیرونِ شہر راجستھان نگم کی بسوں کے

علاوہ پرائیویٹ بسوں کا بھی اچھا خاصہ انتظام ہے۔ فتح پور سے دہلی، ہریانہ، جے پور، جودھپور اور بیکانیر تک روڈویز سرگرداں نظر آتی ہے۔اب تو آرام بسیں بھی کثرت سے چلتی ہیں۔

میلے اور تہوار

راجستھان میں میلے ٹھیلے نہ ہوں تو اس کی رونق ماند نظر آتی ہے۔ شیخاواٹی کے مسلمانوں کے عام تہوار تو عید اور بقر عید ہی ہیں البتہ محرم کے مہینے میں 'تعزیہ داری' کا تہوار بھی نہایت جوش و خروش سے منایا جاتا تھا۔ ماہ محرم کا پہلا عشرہ ڈھول تاشوں کی آوازوں سے گونجتا رہتا تھا۔ خانجیوں کا محرم، پیر کے روضے کا محرم، سائرہ قصیانی کا محرم، تیلیوں کا محرم، بیوپاریوں کا محرم اور نہ جانے کتنی برادریوں کے چھوٹے چھوٹے محرم ایک جلوس کی صورت دس تاریخ کو پورے بازار کا چکر کاٹ کر کربلا تک کا سفر طے کرتے تھے۔ محرم کے مہینے میں چھوٹے اور بڑے 'حسن حسین' کے فقیر بن کر گھر گھر مانگنے جاتے۔ باجرا، گیہوں، مونگ، مونٹھ ایک ہی جھولی میں جمع کرتے اور پھر اس کا کھچڑا بنا کر بستی کے غریبوں میں تقسیم کرتے۔ سات محرم کو ملیدہ بنتا، چراغوں کی قطار تھالیوں میں سجا کر حضرت قاسم کی مہندی امام باڑے تک لائی جاتی۔ فتح پور میں خانجیوں کا اکھاڑا مشہور تھا۔ چاند رات ہی سے امام باڑے کے سامنے میدان کو محصور کر کے اکھاڑا بنا دیا جاتا۔ عورتوں اور بچوں کیلئے الگ جگہ ہوتی۔ اکھاڑے میں لاٹھی، بانا، تلوار کے کارنامے پیش کیے جاتے لیکن عام پبلک کو ہمیشہ دو چہروں کی تلاش رہتی: شبیر پیر اور مسعود خان چوہان۔ دونوں کی جوکنگ عوام میں مقبول تھی۔ دونوں مختلف طرز کے سوانگ رچ کر عوام کو قہقہے لگانے اور تالیاں بجانے پر مجبور کر دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ڈھول تاشے بجانے والوں کے فن کو بھی سراہا جاتا۔ ایک ردم، ایک لے اور ایک تان کے ساتھ ڈھول تاشے بجانے والوں میں مقابلہ ہوتا۔ عوام جھوم جھوم جاتے۔ جس طرح شعر پر واہ ہوتی ہے اسی طرح ڈھول تاشوں کی بجائی پر بھی داد ملا کرتی تھی۔

دس تاریخ کو جب تعزیوں کا جلوس بازار سے ہوتا ہوا کربلا کی طرف روانہ ہوتا تو اس کا گزر ہندوؤں کے محلّہ سے ہوتا تھا۔ ہندو اپنا کاروبار بند کر کے اس جلوس کو خوشی سے دیکھتے۔ آگے آگے اکھاڑا چلتا۔ برہنہ تلواروں سے 'ہائی دوس' کھیلا جاتا۔ اس کے آگے لاٹھیوں کے مقابلے ہوتے، بانا بھی گھمایا جاتا۔ چوک چوراہوں پر ڈھول تاشے بند کر کے تعزیوں کے سامنے قصیدے، مرثیے اور سلام پڑھے جاتے۔ خاص طور سے کبوتر نامہ بہت پسند کیا جاتا۔ صدیق سیاں کی آواز ماحول میں ارتعاش پیدا

کر دیتی۔ لیکن زہریلی اور متعصب سیاست نے اب اس منظرنامے کو اُلٹ دیا۔ مسلمان سے ان کا راستہ چھین لیا گیا۔ سارا نقشہ بدل گیا ہے۔ احتجاجاً خانجیوں نے اپنا محرم ایستادہ کر دیا ہے۔ وہ جلوس میں شامل نہیں ہوتے۔ دس دنوں تک امام باڑے ہی میں تعزیہ رکھتے ہیں۔

تیج اور گنگور

ساون کے مہینے میں یہاں تیج کا تہوار ہندو عورتوں میں دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ جب برسات ہوتی ہے تو بوندوں کے ساتھ لال رنگوں کی تیجوں کی بارش بھی ہوتی ہے۔ بھوری مٹی کی زمین پر یوں لگتا ہے جیسے کسی نے لال موتیوں سے جڑی چنری دھرتی کے جسم پر ڈال دی ہو۔ مجھے خود اپنے بچپن میں تیجوں سے کھیلنا یاد ہے۔ صبح اُٹھتے ہی گھر کے صحن میں لال رنگ کا جانور خراماں خراماں تفریح کرتا نظر آتا تھا۔ بچے اسے چیونٹی سے پکڑ کر ہتھیلی پر رکھ لیتے۔ جب تیج ہتھیلی پر رقص کناں ہوتی تو عجیب سی گدگداہٹ کا احساس ہوتا۔

چیت کے مہینے میں گنگور کا تہوار آتا ہے۔ یہ بھی راجستھانی عورتوں کے لیے مسرت کا پیغام لاتا ہے۔ فتح پور میں بھی یہ تہوار بڑے اہتمام اور جوش و خروش کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ شہر سے باہر چوڑو کے راستے پر ریلوے پل کے قریب اونٹوں، بیلوں اور گھوڑوں کی ریس ہوتی ہے۔ میلہ لگتا ہے۔ ڈھول باجے بجتے ہیں، ناچ گانا ہوتا ہے۔ مسلمان مرد بھی اس میلے میں شرکت کرتے ہیں۔

بدھ گروجی کا میلہ

بدھ گروجی کی منڈی شہر سے تقریباً دو کوس کے فاصلے پر جنوب میں اس ریتیلے ٹیلے پر بنی ہوئی ہے جسے عرفِ عام میں 'چھوٹی بھر' کہتے ہیں۔ اسی منڈی کے دامن سے سیکر بیکانیر روڈ دونوں سمتوں میں بڑھتی ہے۔ روایت ہے کہ بدھ گروجی مہاراج نے جیوت مٹی لی تھی۔ یعنی زندہ درگور ہوئے تھے۔ یہاں ہر سال شیوراتری کے موقع پر میلہ بھرتا ہے۔ قرب و جوار کے دیہاتوں سے شائقین اس میلے میں شرکت کے لیے آتے ہیں۔ جنگل میں لوگوں کا ہجوم اس میلے کی افادیت کو بڑھا دیتا ہے۔ یہاں بھی اکھاڑے جمتے ہیں۔ کشتیاں ہوتی ہیں۔ 'مالا' دیا جاتا ہے (ایک بڑا سا موٹھ والا پتھر جسے ایک ہاتھ کی اُنگلیوں سے پکڑ کر سر سے اوپر اٹھا لیا جاتا ہے، اسے مالا دینا کہتے ہیں)۔ یہاں جوانوں کے زورِ بازو کے

امتحان الگ الگ شکلوں میں ہوتے ہیں۔ چنگ اور دف کی تال پر لوک گیتوں کے مقابلے ہوتے ہیں۔ مردوں کا رقص ہوتا ہے، ہار جیت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ بانسری کے شوقین بھی اس میلے میں شرکت کر کے بے حد محظوظ ہوتے ہیں۔ ہندو مسلم سبھی اس میلے میں شریک ہوتے ہیں۔ رنگ برنگی کھلونوں کی دکانیں لگتی ہیں۔ مٹھائی اور چاٹ کے ٹھیلے والے ہجوم کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ایک سے ایک بڑھ کر آواز لگاتے ہیں۔ یہاں بھنگ کی قلفیاں کثرت سے فروخت ہوتی ہیں۔ نوجوان انہی قلفیوں کے نشے میں رقص کرتے ہیں۔

بھوری مٹّی

فتح پور کے بیہڑ میں بھوری مٹی کے چھوٹے بڑے ٹیلے جگہ جگہ موجود ہیں۔ صحرا نوردی کرنے والوں کو یہ ٹیلے بڑا لطف دیتے ہیں۔ لیکن گرمیوں کی دھوپ میں مٹی شعلہ بن جاتی ہے۔ ننگے پیر چلنے کی اس وقت کوئی ہمت ہی نہیں کرسکتا۔ جب آندھی چلتی ہے تو یہ ٹیلے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں۔

کون ذرّوں میں چھپا ہے اس کی ہے کس کو خبر
لائی ہے ٹیلے اڑا کر آندھیاں کس کے لیے

بگولے جب اُٹھتے ہیں تو مٹی کے دامن میں بھنور بن جاتے ہیں اور پھر یہ بھنور آسمان کی سمت پرواز کرتے ہیں۔ مقامی زبان میں اس بھنور کو "بھنگولیا" کہتے ہیں۔ اس بھنور کی زد میں آنے والی اشیاء اُڑ کر کہیں اور جا گرتی ہیں، عموماً کپڑے، لکڑی کے ٹکڑے، ٹین کے پترے وغیرہ۔ دوپہر کی دھوپ میں یہاں سراب کے منظر بڑے دلفریب لگتے ہیں۔ دھوپ میں یہ مٹی سونے کی مانند چمکتی ہے۔

منسٹر گاڑی

آج کل فتح پور کے بازار میں اَناج ڈھونے کا کام گدھا گاڑی سے لیا جاتا ہے۔ محلوں اور گلیوں میں بھی یہی گاڑی بوجھ ڈھونے کا کام کرتی ہے۔ عرفِ عام میں اسے "منسٹر گاڑی" کہتے ہیں۔ یہ گاڑیاں اب یہاں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

ترنم کے جادوگر

فتح پور میں ترنم کا جادو ہر دور میں سر چڑھ کر بولتا رہا ہے۔ فتح پور کے چوتھے نواب دیوان ناہر خاں جن کی نوابی کا زمانہ ۱۵۱۳ء سے ۱۵۴۵ء تک تھا، نغمہ و موسیقی کے دلدادہ تھے۔ دور دور سے گائک اور سنگیت کے رسیا نواب کے دربار میں آکر اپنا ہنر پیش کرتے اور داد و تحسین سے دامن بھر کر لے جاتے۔

رام گوپال ورما اپنی کتاب 'نگر فتح پور نگراں ناگر' میں رقمطراز ہیں:

"فتح پور بھوک سہہ سکتا ہے، پیاس سہہ سکتا ہے، سارے دُکھ اُٹھا سکتا ہے، تکلیف برداشت کر سکتا ہے لیکن گائے بنا نہیں رہ سکتا۔ فتح پور آنسوؤں میں ڈوب کر بھی گائے گا، پر گائے گا ضرور۔

یہ نگر گاگا کر جاگتا رہتا ہے۔ یہاں کوئی رات ایسی نہیں گزرتی کہ کہیں ڈھولک کی تھاپ اور گویے کی جاگ نہ لگے"۔

فتح پور میں گائیکی کی مختلف شکلیں ہیں۔ ایک طرف بھجن منڈلی گا رہی ہے۔ دوسری طرف کرتن ہو رہے ہیں۔ تیسری طرف فضا میں محفل میلاد اور نعت خوانی کا نورانی اثر چھایا ہے۔ محرم کے مہینے میں تعزیوں کے سامنے کبوترنامہ پیش کرنے والے صدیق سیاں کی پُر سوز آواز کو فتح پور کی سماعت کیسے بھول سکتی ہے۔

یا محمدؐ کربلا میں لوٹا بچارا گیا   آپ کا پیارا نواسہ سجدے میں مارا گیا

کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ مرثیے کے رنگ میں لکھا یہ کبوتر نامہ اپنے اندر ایک پُر سوز اور المناک کیفیت رکھتا تھا۔ صدیق سیاں، فقیروں کا فقیر، شاہوں کا شاہ، بھیڑ میں دور سے پہچانا جانے والا مجذوب۔ گونڈے کی ٹوپی جس کا نشان، جاکیٹ جس کی پہچان، سرمے سے لدی پھندی آنکھیں، نعت اور مرثیے پڑھ پڑھ کر زندگی کے دُکھوں کا علاج کرنے والا صدیق سیاں۔ جس کی آواز نے برسوں لوگوں کی سماعت پر راج کیا۔ فن ترنم کی جس نے بے لوث خدمت کی۔ ایسے خادموں سے فتح پور کا ماضی بھرا پڑا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے شعر نہیں کہا لیکن شاعری کے ماحول کو گرم رکھا۔ اچھے شعر اور دلکش آواز کے ساتھ سماعتوں کو نہال کرتے رہے۔

چاندنی میں نہائی نکھری ایک اور آواز کے مالک حاجی عثمان غنی نیلگر۔ چہرا چاند کا ٹکڑا۔ دھان پان جسم کے مالک، اسکول کے زمانے میں اپنی خوش گلوئی کے سبب جو عزت اور ہر دلعزیزی ان کو ملی تھی وہ آج بھی قائم ہے۔ ۱۹۵۲ء کا زمانہ، عیدگاہ اسکول کا میدان، شامیانہ سجا ہے، شادیانے بج رہے ہیں۔ فتح پور شہر کے ایک غریب پرور سیٹھ سوہن لال جی ڈگڑ کی آمد آمد ہے۔ بڑوں اور بچوں کی نگاہیں دروازے پر لگی ہیں۔ شام کے سائے ڈھل رہے ہیں۔ سیٹھ صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ مائک کے لب کھلتے ہیں۔ پیر محمد عارف فتح پوری کا استقبالیہ گیت حاجی عثمان کے معصوم گلے سے اپنی زندگی کا اعلان کرتا ہے ؂

کون آیا بن کے مہماں مہربانِ عیدگاہ   کس کی آمد سے ہوئے خوش طالبانِ عیدگاہ

نغمہ وہی جو سر چڑھ کر بولے۔ پچاس برسوں کے بعد بھی اس استقبالیہ نغمہ کی دھن فتح پور کی فضاؤں میں موجود ہے۔ حاجی عثمان غنی کی غنائیت سے بھرپور آواز نے ہمیشہ ذوقِ سماعت کو نہال رکھا۔ پارسا کوثری کی غزل، صبا افغانی کی غزل، جگر کی غزل، شکیل کی غزل، خمار کی غزل، مرحوم محمد رفیع کی گائی فلمی غزلیں اور بے مثال فلمی گیت۔ حاجی عثمان غنی کی آواز میں آواز ملاتے ان کے ہمعصر، احباب، ان سے پہلے کے کچھ لوگ۔ بعد کی نسل، ایک سلسلہ ہمیشہ قائم رہا۔ شعر ہمیشہ فتحپور میں زندہ رہا۔ تخلیقی طور پر نہ سہی مگر مختلف آوازوں کے توسط سے شاعری کا میدان ہمیشہ گونجتا رہا۔ مرحوم جعفر میر نیلگر کلکتہ میں رہے۔ غزل اور فلمی گیتوں کے رسیا۔ محمود کھوکھر، یوسف غلام محمد بکھید عرف یوسف لنگڑا، یوسف محمد بخش کا گلیا یوسف عبدالقادر کھوکھر عرف بھگوان محلہ بیوپاران سے۔ اونچی پوری شخصیت کا مالک مرحوم نثار پیر۔ جب غزل کے تار چھیڑتا تو فضا میں جادو بھر دیتا۔ تجمل حسین ٹھیکیدار، ملاجی کا شفیع جن کی ہوٹل کسی زمانے میں شعر وادب کا مرکز بنی رہی۔ مرحوم جیون حیات، مرحوم ادریس اور نہ جانے کتنے نام ہیں جنھوں نے اپنی خداداد آواز اور فطری نغمگی کا جادو ہمیشہ جگائے رکھا۔ اس سلسلے میں فتح پور شہر کے میلاد خواں حضرات کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا ایک قسم کی ناانصافی ہوگی۔ مرحوم قاضی رضا محمد شہر قاضی فتح پور شہر، قاضی عبدالغفور مفتی صاحب مرحوم، ان کے فرزند ماسٹر نواب علی، ملاّجی کا شفیع، یاسین پیر کھڑو شاہ، مرحوم حاجی نور محمد خان جوڑ، محبوب قاضی، سراج قاضی، نثار میر، ستار اینڈ پارٹی مومن پورہ کس کس کو داد دیجئے۔ عاشقانِ رسول اکرمؐ جب اپنی اپنی آوازوں میں نعت اور درود و سلام کے تحفے پیش کرتے تو سامعین جھوم جھوم جاتے۔ ہجر رسولؐ کا احساس دلوں سے اُمنڈ کر پلکوں پر لرزنے لگ جاتا۔ مرحوم عبدالغنی خان چودھری (سیکر والے) کی نعت خوانی اور منقبتِ حسینؓ کی رقت انگیز پیشکش کو

آسانی سے بھلایا نہیں جاسکتا۔ کتنے ہی عشاق ان کی زبانی کلام سن کر بے حال ہو جایا کرتے تھے۔

موجودہ نسل میں شفیق نربان، غزل گائیکی کے رموز سے واقف، دلکش آواز کا مالک، مہار اشٹر کے شہر ناسک میں اپنی آواز کا جادو جگا رہا ہے۔

موجودہ شعراء میں نثار احمد راہیؔ، عنبرؔ فتح پوری، غلام جیلانی نجمیؔ، اسماعیل عادلؔ، منصور نیرؔ، شبیر فرازؔ اور غازیؔ فتحپوری اپنے اپنے دلنواز ترنم کے سبب ہی اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کل تک فتح پور میں ترنم تھا غزل نہیں تھی لیکن پچھلے بیس برسوں سے ترنم کے ساتھ ساتھ غزل نے بھی اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلا دیا ہے۔ آج نغمہ بھی فتح پور کا اپنا ہے اور نغمگی بھی اپنی ہے۔

آج فتح پور کے شعراء کی لکھی نعت شریف میلاد کی محفلوں میں پڑھی جانے لگی ہے۔

اس سادگی سے عشق کا قائل ہوا ہے دل　　　اک اونٹنی سوار پہ مائل ہوا ہے دل

قوال بھی فتح پور کے شعراء کا کلام پیش کر کے داد و تحسین سے اپنی جھولیاں بھرتے ہیں۔ قوالوں کا ذکر چلا ہے تو ماضی کی کتاب کے صفحے اُلٹتے ہیں، آئینوں سے گرد صاف کر کے ان خوبصورت منظروں کو دیکھتے ہیں، جن منظروں میں جے پور کے مشہور قوال صدیق جے پوری اور مجید جے پوری کی دلکش اور دلنشیں آوازوں کا جادو بسا ہوا ہے۔

نسیم صبح کیوں اٹھلا رہی ہے　　　گلوں پر کیسی مستی چھا رہی ہے
یہ بلبل گیت کس کے گا رہی ہے　　　چمن کی ہر کلی بتلا رہی ہے
محمدؐ کی سواری آرہی ہے

صوفیانہ نغمہ گونجتا ہے "ترا روم روم ہر ہر بولے" روح کے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔ سماعتوں میں نور سا بھر جاتا ہے۔ ذہن روشن ہو جاتے ہیں۔ غزل مہکتی ہے۔ دل تڑپ اُٹھتے ہیں

ہونا ہی پڑا مائل بہ کرم قائم وہ جفا پر رہ نہ سکے
پتھر کا جگر رکھنے والے اک آہ بھی میری سہہ نہ سکے

قوالی کے شوقین چاند قوال کی جادوئی قوالیوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ تضمین کے ساتھ طویل واقعات پیش کر کے محفل پر جادو کر دینے والا چاند قوال۔ بھرا پورا گائک۔ سیدھا سچا فنکار، سادگی کا پیکر۔ صوفیوں کی محفل میں سرمدی نغمہ پیش کر کے لوگوں کو 'بے حال' کرنا جس کے کمالات میں شامل تھا۔ جب وہ نغمہ چھیڑتا دھڑکنوں کو طوفانوں سے بھر دیتا۔ خون کی گردش بڑھا دیتا۔ کلیجے منہ کو آنے لگتے۔

ترے در سے نسبت جسے ملی دنیا کی دولت اسے ملی عقبیٰ بھی اس کا سنور گیا
امر ہے وہ خوش نصیب ہے جو تری محبت میں مر گیا
یہ دنیا پہلے حسین تھی۔ اب یہ جہنم سے کم نہیں
مرا مرشد مجھ سے بچھڑ گیا میں جوان ہو کے بھی مر گیا

ایک اور منقبت مشہور شاعر عبد اللہ بیدل بیکانیری کے دلی جذبات اور ان کی عقیدت کی منہ بولتی تصویر۔ کتنے ہی قوالوں نے جسے اپنے اپنے انداز سے پیش کر کے عاشقان خواجہ غلام سرور سے خراجِ تحسین وصول کیا۔

کیا جلوۂ خدا ہیں حضرت غلام سرور　　آئینۂ صفا ہیں حضرت غلام سرور
آنکھوں میں ان کے مستی ایسی بھری ہوئی ہے　　جامِ جہاں نما ہیں حضرت غلام سرور
بیدلؔ تڑپ رہے ہیں عشاق مٹ رہے ہیں　　کس کی حسیں ادا ہیں حضرت غلام سرور

فتح پور کے سامعین اپنی ادب نوازی کا ثبوت دیتے ہیں تو قوالوں کی جھولیاں بھر جاتی ہیں۔ ترنم ہمیشہ فتح پور کی فضاؤں میں گھلا رہا ہے۔ فتح پور کی ہوائیں نغمہ ریزی کے ہنر سے واقف ہیں۔ گیت یہاں ہر موسم میں بیدار رہتا ہے۔ شادی بیاہ اور سگائی کی رسموں میں ڈھولک کی تھاپ پر گونجتی دو میراثی بہنوں کی آواز بھلائے نہیں بھولتی، بسم اللہ اور بصرہ۔ گیتوں کا سنگھار، زنان خانے کی بہار، جنھوں نے کبھی مَردانے میں اپنا ہنر پیش نہیں کیا۔ جو کبھی عام محفلوں کی جان نہیں بنیں۔ جنھوں نے کبھی اپنی گائیکی کا سودا نہیں کیا۔ جو مل گیا اسی کو مقدر سمجھ لیا۔ لالی اور پاؤڈر سے کبھی سابقہ نہیں رکھا۔ سر سے کبھی اوڑھنی نہیں سرکنے دی، نیچی پلکوں سے، سر جھکائے، دھیمے سُروں میں 'ہریالا بنڑا' گانے والی دونوں بہنیں، بہت زیادہ شوخی پر اُتر آئے تو 'جھلمل کی ٹوپی گلے میں گلا بند، بولو کہاں گئے تھے' کی حدوں سے آگے نہ بڑھیں۔ گائیکی میں شرافت کی علامت۔ برسوں نغمے کو زندہ رکھا، خود اُجڑ گئیں لیکن گیت کو اُجڑنے نہیں دیا۔ فنونِ لطیفہ کو زندہ رکھنے کے لیے کیسے کیسے فنکاروں نے اپنی جان کی بازی لگادی۔ نئی نسل ان کو بھول چکی ہے لیکن فتح پور کا پرانا آدمی آج بھی ان کی یادوں کو اپنے سینے سے لگائے زندہ ہے۔ غزل کی ایک سنجیدہ آواز، بسنتی، جس نے کلکتہ اور ممبئی کی فضاؤں کو اپنی آواز سے بیدار رکھا۔ درگاہ حاجی نجم الدین کے بلند دروازے کی جھانکی میں بیٹھ کر نوبت نقارے بجانے والے سادولا میر اور عمر دین میر کو بھلانا آسان نہیں۔ جمعرات کی شام عصر اور مغرب کی نمازوں کے درمیان نوبت نقاروں کی گونج سے شہر کے کان اس قدر آشنا ہو چکے تھے کہ کبھی جب نوبت نہیں بجتی تو تشویش سی ہونے لگتی۔

معروف گلوکارہ بسنتی

بسنتی جی چورو سے بیاہ کر فتح پور آئی تھیں۔ رام گوپال جی کی چھتریا کے سامنے، دھوبیوں کے محلہ کی طرف جانے والے راستے پر ان کا گھر تھا۔ اسکول کے زمانے میں اکثر میرا اس طرف سے گزر ہوتا تھا۔ سال دو سال میں نے حاجی وزیر دھوبی اسکول میں بھی تعلیم حاصل کی ہے۔ گھر سے اسکول جاتے وقت بسنتی کا گھر راستے ہی میں پڑتا تھا۔ مجھے یاد ہے ہم بچوں میں بسنتی کے اور ان کے گھر والوں کے تعلق سے اچھی رائے نہیں تھی۔ ادھر ہمارے گھروں کی عورتوں میں بھی بسنتی کا نام مشہور تھا حالانکہ بسنتی نے فتح پور میں کبھی کوئی عوامی پروگرام نہیں کیا۔ اس نے اپنے فن کا مظاہرہ کلکتہ اور ممبئی کے راجستھانی اور مارواڑی سیٹھوں اور ساہو کاروں ہی کی محفلوں میں کیا۔ کسی زمانے میں B.B.C. لندن سے بسنتی کی غزلیں نشر ہو چکی ہیں۔ میں نے ایک بار درگاہ حاجی نجم الدین آفتابِ شیخاواٹی میں حاضری دیتے ہوئے بسنتی کو دیکھا بھی اور سنا بھی۔ وہ میری نوعمری کا زمانہ تھا۔ مجھے یہ تو یاد نہیں کہ بسنتی نے اس وقت کون سی چیز پیش کی تھی، لیکن بسنتی کا حلیہ مجھے یاد ہے۔ درمیانے قد کی دبلی پتلی، گھریلو قسم کی ایک خاتون، سفید ساڑی میں لپٹی۔ پورا سر ڈھانپے ہوئے۔ احترام کے ساتھ، گردن جھکائے، نیچی نظریں کیے۔ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ مرحوم نور الحسن صاحب گدی نشین تھے۔ سامعین کی تعداد بھی مختصر سی تھی۔ کچھ لوگوں نے نذرانے بھی پیش کیے جو بسنتی نے شکریہ کے ساتھ قبول کیے۔ بسنتی کا انتقال کب اور کہاں ہوا یہ معلوم نہ ہو سکا۔

شفیق فتح پوری

شفیق شبیر خان نربان کا بچپن مہاراشٹر کے ناسک شہر میں گزرا۔ ناسک ہی میں شفیق نے حصولِ تعلیم کے مدارج طے کیے۔ بچپن ہی سے گانوں میں دلچسپی تھی۔ دھیرے دھیرے یہ شوق عادت میں بدل گیا اور پھر ضرورت بن گیا۔ ناسک، ممبئی اور سیکر میں کچھ اُستادوں سے شفیق نے موسیقی اور گائیکی کے گر بھی سیکھے۔ شفیق کے گائے ہوئے نعتیہ کلام کی ایک کیسٹ بھی بنی۔ شفیق کی آواز کا یہ کمال ہے کہ وہ غزل اپنی ہی طرز اور اپنی ہی آواز میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن فلمی گیت وہ رفیع، مکیش، کشور اور دیگر لوگوں کی طرز پر گا لیتے ہیں۔ بلا کا حافظہ ہے۔ ہزاروں غزلیں منہ زبانی یاد ہے۔ ان دنوں وہ فتح پور میں قیام پذیر ہیں اور گائیکی کو حصولِ معاش کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ خود بھی شعر کہنے لگے ہیں۔

شیخاواٹی میں پہلی تصنیف کے خالق

سلطان التارکین کے مصنف نے فتح پور شیخاواٹی کے بزرگ صوفی شاعر حضرت حاجی نجم الدینؒ کو اُردو کا پہلا صاحبِ تصنیف شاعر بتایا ہے۔ اگر اس تحقیق کو صحیح مان لیا جائے تو اس حقیقت کو بھی مان لینا چاہیے کہ یہاں اُردو کی اشاعت و تصنیف کا کام تاخیر سے شروع ہوا۔ لیکن ڈاکٹر ابو الفیض عثمانی نے اپنی مرتبہ کتاب 'تخلیقات' کے صفحہ نمبر ۱۱ پر مقدمے کے تحت لکھا ہے :

"لیکن حقیقت یہ ہے کہ راجستھان میں اس سے پہلے اُردو شعر و ادب کے سراغ ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ریاست جے پور کے ایک قصبہ 'دائرہ' میں مہدویہ فرقہ کے چند بزرگوں نے اُردو میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس سلسلے کے ایک بزرگ محمد جی میاں ولد شیخ مجتبیٰ نے ایک ضخیم مثنوی 'تاریخِ غریبی' کے نام سے ۱۱۶۴ھ مطابق ۱۷۴۷ عیسوی میں تصنیف کی تھی۔ اس کا ایک نسخہ عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک میں محفوظ ہے"۔

(ڈاکٹر فیروز نے اس نسخے کی تاریخ ۱۱۷۰ھ مطابق ۱۷۵۲ عیسوی بتائی ہے۔)

تحقیق ایک ایسی زمین ہے جس کو جتنی گہرائی تک کھودا جائے اتنے خزانے ملتے ہیں۔ کوئی بھی تحقیق حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ محقق اتنا ہی بیان کرے گا جتنا اس کے پلّے آیا ہے۔ راجستھان کے محققوں نے شیخاواٹی پر کبھی بھرپور توجہ نہیں کی۔ خواجہ نجم الدین فاروقی جیسے مصنف و شاعر جنھوں نے اپنی ۵۲ سالہ زندگی میں فارسی اور اُردو کی ۵۲ کتابیں تصنیف کیں ان کا کام اور نام ابھی تک پردۂ خفا میں ہے۔ تذکرہ نگاروں نے اگرچہ کہیں کہیں ان کے حوالے پیش کیے ہیں لیکن یہ حوالے بھیڑ کا حصہ ثابت ہوئے ہیں۔ صرف نام گنوا دینے سے کارنامے نمایاں نہیں ہوتے۔ خواجہ صاحب کی علمی، ادبی خدمات کا ابھی تک بھرپور اعتراف نہیں کیا گیا ہے۔

جناب عبد الحفیظ باحلیم اپنی کتاب راجستھانی زبان مطبوعہ کراچی کے صفحہ نمبر ۱۲۵ - ۱۲۶ پر رقمطراز ہیں :-

"متاخرین میں اس خاندان (صوفی حمید الدین ناگوری کا خاندان) کے مشہور بزرگ خواجہ نجم الدین فاروقی تھے جن کی مستقل سکونت فتح پور سیکر میں تھی مگر جودھپور اور ناگور بھی اکثر قیام رہتا تھا۔ انھوں نے اپنے پیچھے لا تعداد تصانیف چھوڑی ہیں جن میں گلزار وحدت (اُردو) بیان الاولیاء (اُردو)، دیوانِ نجم (فارسی اور اُردو) مشہور ہیں"۔

ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی اپنی مرتب کردہ کتاب 'تخلیقات' کے صفحے نمبر ۹ پر لکھتے ہیں:-

"اسی سلسلے کے دوسرے بزرگ حاجی نجم الدین پروانہ صاحبِ تصنیف، ادیب اور شاعر تھے جن کی تصانیف کی نشاندہی کرتے ہوئے مرتب 'سلطان التارکین' نے ان کو راجستھان میں اُردو کا اوّلین مصنف بتایا ہے"۔

ڈاکٹر فیروز نے اپنے مضمون "راجستھان میں اُردو زبان کا ارتقاء ۱۸۵۷ء تک" میں لکھا ہے:-

"گلؔ (مرزا اکبر علی بیگ گل) کے علاوہ خواجہ نجم الدین پروانہؔ، پرتگالی شاعر ڈان ایلس ڈی سلوا فطرتؔ، فقیر محمد خاں گویاؔ، نظام الدین عیشؔ، شیخ عطا حسین شورؔ، منشی بھاون لال شاداںؔ، خواجہ نجم الدین نجمؔ، پنا لال مشتاقؔ، دل سوز، میر امانت علی خاں امانت ناگوری، عبدالرحمٰن تمناؔ، جعفر علی وغیرہ راجستھان میں اُردو کے ارتقائی دَور کے سفر سے متعلق ہیں"۔

(سہ ماہی نخلستان، شمارہ نمبر ۲، جلد نمبر ۱۳۔ جولائی تا ستمبر۔ خصوصی شمارہ کل ہند اُردو کنونشن نمبر۔ صفحہ ۸۱ - ۸۲)

یہاں ڈاکٹر فیروز سے ناموں کے معاملے میں تسامح ہوا ہے۔ دراصل خواجہ نجم الدین پروانہ اور خواجہ نجم الدین نجم ایک ہی بزرگ کے نام ہیں۔ خواجہ صاحب کا تخلص 'پروانہ' ان کے کلام میں کہیں نہیں ملتا۔ روایت کے مطابق ان کے پیر و مرشد نے انھیں 'پروانہ' کا خطاب عطا کیا تھا۔ آپ کا تخلص 'نجم' تھا۔ مثالیں موجود ہیں ۔

اے نجمؔ تم تو عشق میں ثابت قدم رہو	دنیا کی سن ملامتیں زاہد تو ڈر گیا
کر دیا ہے نجم کو اس عشق نے خانہ بدوش	ہو گیا ہے شوق میں تیرے دیوانہ اے صنم
ہاتف نے مجھ کو دی ہے بشارت یہی نجمؔ	کافی ہے تجھ کو یار کے چہرے کا اک خیال
گر وصالِ یار چاہتا ہے نجمؔ	دے اسی رستے میں اپنا جان و مال

(خواجہ نجم الدین صاحب نے اپنے تخلص کو دو اوزان میں نظم کیا ہے۔ یہ مثال پورے دیوان میں موجود ہے۔)

راجستھان اُردو اکادمی نے بھی اپنے تحقیقی سمیناروں میں کبھی خواجہ نجم الدین فاروقی پر کوئی مقالہ قلمبند نہیں کرایا۔ یہ موضوع قابل توجہ ہے۔

فتح پور کے نواب الف خاں کے فرزندِ دوئم نعمت خاں جانؔ کوی کی جانب اُردو والوں نے توجہ نہیں کی ہے۔ اگر ان کے تمام مسودات کی تلاش کی جائے تو شاید فارسی کا کوئی مسودہ دستیاب ہو جائے۔ کیونکہ جانؔ کوی فارسی کا عالم بھی تھا۔ اس کے موجودہ ۷۵ ر مسودوں میں چند کے عنوانات اس طرح ہیں: 'درس نامہ'، 'بازنامہ'، 'لیلیٰ مجنوں'، 'ظفر نامہ نوسیرواں کا'، 'کتھا قلندر کی'، 'تمیم انصاری کی کتھا'...... مذکورہ عنوانات سے مسودات کے متن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

عارفؔ فتح پوری کا استقبالیہ نغمہ

۱۹۵۲ء میں جب فتح پور میں ایک غریب پرور سیٹھ سوہن لال جی ڈگڑ عیدگاہ اسکول میں تشریف لائے تو ان کی آمد پر بچوں کی جانب سے مختلف تہذیبی اور ثقافتی پروگرام پیش کیے گئے تھے۔ غلام شبیر سرور خان پڑھیار نے ایک ڈرامہ پیش کیا تھا "اندھیر نگری چوپٹ راج" جس میں غلام شبیر نے بڑے ہی فطری انداز میں راجہ کا رول نبھایا تھا۔ چستہ اور شستہ اُردو میں مکالموں کی ادائیگی نے ان کے کردار میں چار چاند لگا دیے تھے۔ ڈرامے کی ہدایت کاری کے فرائض مرحوم ماسٹر اصغر علی خان پڑھیار نے انجام دیے تھے۔ اصغر ٹھیکیدار اور ستار پنوار نے ایک لوک گیت رقص کے ساتھ پیش کیا تھا۔ اور بھی مختلف پروگرام پیش کیے گئے تھے لیکن اس بے مثال اور یادگار گیدرنگ کی ابتدا ایک بہت ہی خوبصورت نغمہ سے ہوئی تھی جسے حاجی عثمان غنی نیلگر نے اپنی دلکش آواز سے زندگی عطا کی تھی۔ اس نغمہ کو پیر محمد عارفؔ فتح پوری نے تحریر کیا تھا۔ اس وقت فتح پور میں شعر و سخن کا کوئی ماحول نہیں تھا گویا یہ پہلا نغمہ تھا جو فتح پور کے کسی شاعر کا لکھا ہوا تھا اور عوام کے سامنے پیش ہوا تھا۔ اس لیے یہ نغمہ فتحپور کے تخلیقی ادب کی بنیاد میں پہلا پتھر تسلیم کیا جائے گا۔ حالانکہ اس نغمے کے خالق کا تعلق بھی درگاہ حاجی نجم الدین ہی سے تھا۔ لیکن عوام میں اس کی مقبولیت نے اسے عوامی گیت بنا دیا تھا۔ اس کی دھن کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔ چوک اور بازاروں میں اس کی گونج سنائی دینے لگی تھی۔ آج بھی یہ نغمہ عیدگاہ اسکول کی علامت کے طور پر موجود ہے۔ اسکول میں آج بھی مہمانوں کی آمد پر اسی نغمہ سے استقبال کیا جاتا ہے۔ پچاس برسوں میں اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے۔ اگرچہ ہر دور میں گانے والوں کی آواز بدلتی

رہتی ہے لیکن نغمہ کے بول اور اس کی دُھن میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔ نغمہ مندرجہ ذیل ہے:

اسلامیہ اسکول عیدگاہ فتح پور کا خصوصی استقبالیہ نغمہ

کس کی آمد سے ہوئے خوش طالبانِ عیدگاہ
کون آیا بن کے مہماں مہربانِ عیدگاہ

آپ کی آمد سے روشن ہوگئی ہے انجمن
کھِل گیا ہے غنچہ ہائے گلستانِ عیدگاہ

جن کی شہرت ہے زمانے میں سخاوت کے لیے
جلوہ فرما آج ہیں وہ درمیانِ عیدگاہ

بالیقیں بخشی زمانے کو وفا کی مشعلیں
اللہ اللہ دیکھ کیا ہے شان، شانِ عیدگاہ

ہمتِ عالی سے اہل علم کے اے ہم نشیں
نہ رُکا ہے نہ رُکے گا کاروانِ عیدگاہ

یا الٰہی صاحبِ ادراک کو توفیق دے
وہ بھی سمجھیں اور سمجھائے زبانِ عیدگاہ

ایک عارفؔ ہی نہیں ہے خیر مقدم کے لیے
اور بھی ہیں آج صدہا حامیانِ عیدگاہ

فتح پور کی ادبی انجمنیں

بقول جناب صدیق غوری فائق الہندی "فتح پور کی سب سے پہلی ادبی انجمن "انجمن شمع اُردو" کے نام سے محلّہ بیوپاران میں ۱۹۴۵ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس انجمن میں تعلیم یافتہ احباب شامل تھے۔ انجمن کے تحت مشاعرے کا انعقاد تو کبھی عمل میں نہیں آیا۔ البتہ عیدین کے موقع پر انجمن کی جانب سے جلسے ہوتے تھے جن میں مذہبی امور پر تقاریر ہوتی تھیں۔ اکثر موقعوں پر غالبؔ اور اقبالؔ کا کلام سنا کر حاضرین اس پر مکالمہ کرتے تھے۔ اُردو کے ان نامور شاعروں کا کلام سمجھنے اور سمجھانے کی ایک

کوشش ہوتی تھی۔ اسی بہانے شعر و نغمہ کا ماحول بنا رہتا۔ جس کے سبب اُردو عام سماعتوں پر بھی دستک دیتی رہتی اور شیرینیٔ گفتار سے دل نہال ہوتے رہتے۔

بزم شاھد - اس کے بعد مرحوم شاہد رتلامی کے شاگردوں نے "بزم شاہد" قائم کی تھی۔ جس کے تحت گھریلو محفلیں اور مشاعرے ہوتے تھے۔ بزم شاہد کا پہلا دفتر ہوٹل سائکل مار کے ایک کمرے میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ ۱۹۹۰ء کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ ۶ر جنوری ۱۹۹۲ء کی شام پونہ سے آئے عوامی شاعر دلدار ہاشمی اور راقم الحروف کے اعزاز میں بزم ہٰذا کے تحت ایک نشست ہوئی تھی۔ اس کے بعد یہ دفتر دوسری جگہ اسی سڑک پر ڈاکٹر ابراہیم پٹھان کے دواخانے کے برابر والی عمارت کے ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ لیکن اب بزم شاہد کا وجود باقی نہیں رہا۔ پچھلے برسوں بزم کی ادبی سرگرمیاں بھی دِکھائی نہیں دیں۔ اس بزم کے صدر جناب نثار احمد راہی تھے۔

بزم احساس ادب - اس بزم کا قیام اتفاقیہ عمل میں آیا۔ شبیر فراز اور ان کے احباب نے مل کر بزم کی بنیاد رکھی۔ جن میں جناب یونس خاں جوڈ ہیڈ ماسٹر اسلامیہ اسکول عیدگاہ، عادلؔ فتح پوری، اختر حسین خان پیٹوان، وقارؔ فتح پوری، اقبال اسحاق خان پڑھیار، امتیاز احمد عرف من پھول خاں شامل تھے۔ عادلؔ فتحپوری کی کتاب "نذیرؔ فتح پوری ایک دوست ایک شاعر" اسی بزم نے شائع کی تھی۔ اس بزم کے تحت آل انڈیا مشاعرے بھی ہوئے۔ جن میں جناب مخمور سعیدی، جناب شین کاف نظام، اے ڈی راہی، ڈاکٹر سخاوت شمیم، ملکہ نسیم صاحبہ، شکیل جے پوری اور فاروق انجینئر نے شرکت فرمائی۔ اسی بزم کے تحت نذیرؔ فتح پوری کی کتاب "جگن ناتھ آزاد ایک مستقل ادارہ" کی رسم اجراء جناب شین کاف نظام اور عادل کی کتاب 'نذیر فتح پوری ایک دوست ایک شاعر' کی رسم اجراء جناب ڈاکٹر سخاوت شمیم کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ صدارت کے فرائض جناب منصور چوروی نے انجام دیے تھے اور مہمانِ خصوصی جناب مخمور سعیدی تھے۔

انجمن ترقی اردو - کے نام سے ایک غیر سرکاری بزم غازیؔ فتح پوری نے قائم کر رکھی ہے جس کے تحت اعزازی مشاعرے اور نشستیں ہوتی رہتی ہیں۔ اظہار مسرت کی کتاب 'کرب خموش' کا اجراء اسی بزم کے تحت ہوا تھا۔ 'برف کی فصلیں' عنبرؔ فتح پوری اور 'قطرے کی وسعت' غازی فتح پوری کے اجراء بھی اسی بزم کے تحت عمل میں آئے تھے۔ اسی بزم کے تحت منصور چوروی اور اظہار مسرت کے لیے اعزازی مشاعرے کیے گئے تھے۔

معلومات کے مطابق کوئی انجمن رجسٹر نہیں ہے۔ باقاعدہ کسی انجمن کے قواعد و ضوابط بھی

نہیں ہیں۔ ممبر سازی کا بھی کوئی مرحلہ پیش نہیں آتا۔ پھر بھی جو بزم جس حال اور جس صورت میں موجود ہے، اُردو کی فلاح کیلئے برسرِ پیکار ہے۔ شعر و سخن کی آواز زندہ اور ماحول کو گرم رکھنے کا ذریعہ ہے۔

مشاعرے اور نشستیں

فتح پور کا پہلا مشاعرہ تو وہی تھا جسے عشرت دھولپوری نے محلہ بیوپاران میں ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۵ء کے درمیان کیا تھا جس میں پارس رومانی شامل تھے۔ اس کے بعد نثار احمد راہی کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق ۱۹۷۹ء میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ اس مشاعرے میں بیرونی شاعر کہاں سے آئے تھے اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ ۱۹۸۳ء میں جشن مستان کے موقع پر ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا جس میں دیگر شعراء کے ساتھ حفیظ میرٹھی اور رام کرشن مضطر دہلوی نے شرکت کی تھی۔ اس کے بعد ایک آل انڈیا مشاعرہ ۳/ نومبر ۱۹۹۲ء کو لیاقت علی خاں وقار کی جانب سے نذیرؔ فتح پوری کی دختران کی شادیوں کے موقع پر ہوا تھا۔ اس مشاعرے کی صدارت پونہ کے عوامی شاعر جناب دلدارؔ ہاشمی نے فرمائی تھی۔ یہ مشاعرہ منصور چڑوی کے اعزاز میں نذیرؔ فتح پوری کے گھر کے سامنے ہوا تھا۔ نذیرؔ فتح پوری کے ہاتھوں منصور صاحب کو اعزاز دیا گیا تھا۔ فتح پور میں سب سے پہلا اعزاز منصور صاحب کو اسی موقع پر دیا گیا تھا۔ اس مشاعرے میں راجستھان کے نمائندہ شعراء نے شرکت کی تھی۔ پونہ سے دلدارؔ ہاشمی کے علاوہ جمشید عالم فتح پوری، متین انصاری اور جمیل شاہ نوری نے شرکت کی تھی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر اظہار مسرت نے انجام دیے تھے۔

"دیوانِ سرور" کے اجراء پر صحن عیدگاہ میں ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا۔ یہ بھی فتح پور کے یادگار مشاعروں میں سے ایک تھا۔ صحن عیدگاہ میں ایک آل انڈیا مشاعرہ ۲۶/ اکتوبر ۱۹۹۸ء میں بزم احساسِ ادب کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا۔ اس مشاعرے کی صدارت منصور چڑوی نے فرمائی تھی۔ مخمور سعیدی مہمانِ خصوصی تھے۔ نظامت کے فرائض نظام صاحب یعنی شین کاف نظام نے انجام دیے تھے۔ جناب اے ڈی راہی، محترمہ ملکہ نسیم، شکیل احمد شکیل، نذیر فتح پوری، فاروق انجینئر شریک مشاعرہ تھے۔ اسی مشاعرے میں نذیرؔ فتح پوری اور عادل فتح پوری کی کتابوں کا اجراء عمل میں آیا تھا۔

۲۷/ مئی ۲۰۰۰ء کو ایک آل انڈیا مشاعرہ صحن عیدگاہ میں جناب مخمور سعیدی کی صدارت میں ہوا تھا۔ جس کے کنوینر شبیر فراز تھے۔ اس مشاعرے میں منصور چڑوی اور نذیرؔ فتح پوری کو شہری اعزازیہ دیا گیا تھا۔ یہ مشاعرہ راجستھان اُردو اکادمی کے جزوی تعاون سے ہوا تھا۔ اس مشاعرے میں

اکادمی کے چیرمین ڈاکٹر زیدی، سکریٹری معظم علی، خازن فاروق انجینئر اپنے عملے کے ساتھ شامل تھے۔ نظامت جناب شین کاف نظام نے کی تھی۔ اس مشاعرے میں احمد آباد سے معروف شاعر سرشار بلند شہری دہلی سے ڈاکٹر شہپر رسول، جے پور سے محترمہ ملکہ نسیم، شکیل احمد شکیل، کوٹا سے شکور انور، سیکر سے شبیر اثر، اوم پرکاش دل، شری شوقین، علیم رتن گڑی، مقامی شاعروں میں حکیم صبا، نثار احمد راہی، الیاس قمر، عادل فتح پوری، شوکت گوہر اور شبیر فراز نے اپنا اپنا کلام سنایا تھا۔

راجستھان اُردو اکادمی کی جانب سے 'حافظ محمود شیرازی شیرانی ایوارڈ' ملنے کی خوشی میں جناب شین. کاف. نظام کا شہر فتح پور کی جانب سے اعزاز کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر اظہار مسرت کی کتاب کے اجراء پر ایک مشاعرہ محلہ بیوپاران میں ہوا تھا۔ غازی فتح پوری کی کتاب کے اجراء پر بھی ایک مشاعرہ محلہ بیوپاریان میں ہو چکا ہے۔ فتح پور میں عموماً طرحی نشستیں ہوتی ہیں۔ فتح پور کے شعراء طرحی مصرعے پر شعر کہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

بعد کی اطلاع کے مطابق 'بزم شاہد اُردو ادب فتح پور' کے زیر اہتمام ۱۵ر مارچ ۱۹۹۱ء کو 'شام سالک' کا اہتمام آزاد ہائر سیکنڈری اسکول میں کیا گیا تھا جس میں شیخاواٹی کے مقبول شعراء شریک ہوئے تھے۔ ۱۸ر مئی ۲۰۰۰ء کو انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام جناب منصور چوروی کی بہترین ادبی خدمات کے اعتراف میں 'جشن اعزاز منصور چوروی' کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں شیخاواٹی کے معززِ شعراء نے شرکت کی تھی اور اپنے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا تھا۔ ۲۰ر فروری ۱۹۹۹ء کو بھی انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام ایک کل ہند مشاعرہ آزاد اسکول فتح پور میں منعقد ہو چکا تھا۔

اسلامیہ اسکول عیدگاہ فتح پور کی جانب سے یکم جون ۲۰۰۰ء کی صبح اپنے سابق طالب علم راقم الحروف کے اعزاز میں ایک عالیشان جلسہ منعقد کیا گیا۔ شہر کے معزز حضرات نے شرکت فرمائی۔ فتح پور کے ایس ڈی ایم جناب کے ڈی مہرڈا کے ہاتھوں شال پہنا کر راقم الحروف کا استقبال کیا گیا۔ شہر فتح پور کے ایم ایل اے جناب بھنور رو خاں نے راقم الحروف کو ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر جناب یونس خان جوڈ نے پھولوں کے ہار پہنا کر خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر جناب ستار مولے خاں پڑھیار نے اپنی تقریر میں راقم الحروف کی ادبی کاوشوں کو سراہا اور اس بات کو سراہا کہ نذیرؔ فتح پوری نے اپنے نام کے ساتھ فتح پور کے نام کو بھی مشہور کیا ہے۔

نوجوانوں میں شاعری کا ذوق پروان چڑھانے کیلئے اور عوام کو شعر و ادب سے روشناس کرنے کیلئے مشاعرے ہر دور میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔ فتح پور میں بھی اس کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ نئے شعراء مشاعروں کی وجہ سے عوام کے سامنے آ رہے ہیں۔

مہمان شعراء

* عشرت دھولپوری
* شبیر اثر
* عبداللہ آزاد
* پارس رومان
* دلدارؔ ہاشمی
* مستان بیکانیری
* منصور چوروی
* سالک عزیزی
* مخمور سعیدی
* شین. کاف. نظام
* شاہد رتلامی
* راشد ٹونکی
* فراز حامدی
* فاروق انجینئر
* اظہار مسرت
* ملکہ نسیم

عشرت دھولپوری

جناب عشرت حسین عشرتؔ دھولپوری فتح پور نگر پالیکا میں ۲۰ر جون ۱۹۶۴ء کو سکریٹری کی حیثیت سے فائز ہوئے۔ آپ کا قیام ۲۲ر اگست ۱۹۶۵ء تک رہا۔ اپنے اس مختصر سے قیام کے دوران عشرتؔ صاحب نے شعر و ادب کے شیدائیوں کو جمع کر کے شعر و ادب کا ایک ماحول بنادیا۔ عشرتؔ صاحب کی رہنمائی میں کچھ لوگوں نے شعر کہنے کی مشق شروع کردی تھی۔ عشرتؔ صاحب محلّہ بیوپاران کی جس حویلی میں مقیم تھے وہاں شام ہوتے ہی شعر و ادب کا سورج طلوع ہوجایا کرتا۔ عشرتؔ صاحب چونکہ سکریٹری کے عہدے پر فائز تھے، اس لیے ان کے گرد بھیڑ جمع رہتی تھی۔ لوگوں کو جب ان کے شاعر ہونے کا علم ہوا تو ماحول بنتے دیر نہیں لگی۔ فتح پور میں مترنم حضرات کی کمی نہیں تھی۔ لہٰذا محفلیں سجنے لگیں۔ اسی دوران عشرتؔ صاحب نے پارس رومانؔ کے اعزاز میں اسی حویلی کے چبوترے پر ایک مشاعرہ منعقد کیا جس حویلی میں ان کا قیام تھا۔ آزادی کے بعد فتح پور میں یہ پہلا مشاعرہ تھا۔ سامعین کی تعداد بھی خاصی تھی۔ چونکہ میں خود سامعین میں موجود تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس وقت لوگ ٹھیک سے داد دینا بھی نہیں جانتے تھے۔ سامعین میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کی آنکھوں نے پہلی بار مشاعرہ دیکھا اور جن کی سماعت نے پہلی بار شعر سنے۔ یہ مشاعرہ مولوی عبدالسمیع مرحوم کی صدارت میں ہوا تھا۔ فتح پور کے کئی شاعروں نے پہلی بار سامعین کے روبرو شعر پڑھنے کی جسارت کی۔ مجھے یاد ہے پیر معین الدین صاحب کے ایک شعر کو بار بار سنا گیا تھا۔ جس کا ایک مصرع ذہن میں محفوظ ہے:

جیسے کہ ہماری صبح نہیں، جیسے کہ ہماری شام نہیں

مشاعرے کی ابتداء میں سامعین کی خاموشی کا جو ماحول تھا وہ دھیرے دھیرے پگھلنے لگا تھا اور معین صاحب کی غزل تک آتے آتے داد و تحسین کا باسلیقہ ماحول مشاعرے میں دِکھائی دینے لگا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جہاں سے فتح پور میں تخلیقِ شعر کی بنیاد پڑی تھی۔ اس مشاعرے کی نظامت عشرتؔ صاحب نے خود ہی فرمائی تھی۔ انھوں نے 'تاج محل' سے متعلق ایک بہت ہی خوبصورت نظم سنائی تھی۔ شاید

عشرت صاحب کو بھی یاد نہیں ہوگا کہ اپنے فتح پور کے قیام کے دوران انھوں نے بالغ ذہنوں میں شعر و سخن کا جو بیج بویا تھا وہ آج ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ آج فتح پور میں تخلیقی اعتبار سے ایک قابل ذکر ماحول موجود ہے۔ اچھے شعر پر داد دینے والے سامعین بھی موجود ہیں۔ شعر پر مکالمہ کرنے والے حضرات بھی موجود ہیں۔ شاعروں کی یہ پوری نسل عشرت صاحب کے فتح پور سے وداع ہونے کے بعد وجود میں آئی ہے۔ جن مقامی شاعروں نے پہلے مشاعرے میں شعر سنائے تھے۔ عشرت صاحب کے سائے سے محروم ہو جانے کے بعد وہ اپنے ذوق و شوق کے جذبے کو قائم نہیں رکھ سکے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اس شہر میں عشرت صاحب کے بعد ان کی رہنمائی کرنے والا کوئی موجود نہیں تھا۔ لیکن عشرت صاحب جن ادبی چنگاریوں کو ہوا دے کر گئے تھے، عوام کے ذہنوں میں وہ کہیں نہ کہیں موجود تھیں اور ۱۹۷۰ء کے بعد ان چنگاریوں نے مختلف ذہنوں میں اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ فتح پور والوں کو ایک طرح سے عشرت دھولپوری کا شکر گزار ہونا چاہیے جنھوں نے فتح پور میں شعر و سخن کی عمارت کی بنیاد میں پہلی اینٹ رکھی۔ اور درگاہ حاجی نجم الدین کے صحن سے شاعری کے قافلے کو نکال کر فتح پور کے عوام سے تک پہنچایا۔

عشرت دھولپوری ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ غزل ان کی محبوب صنف ہے۔ کبھی کبھی نظم کی زلفوں کو سنوارنے میں بھی عار نہیں کرتے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ 'بوند بوند' کے نام سے بہت پہلے شائع ہوا تھا۔ بقول شاہد پٹھان

"عشرت صاحب کی شاعری کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ پہلے شاعری ہوتی ہے۔ جدید، ترقی پسند اور جدید تر بعد کی منزلیں ہیں۔ وہ چونکہ ایک فطری شاعر ہیں اس لیے جذبہ کو احساس اور احساس کو شعری اظہار بنانے کے لیے فنکارانہ، ہنر سے کماحقہ واقف ہیں"۔ (راجستھان میں نئی غزل کا سفر)

چند اشعار ۔

مری نگاہ رہی شہر کی فصیلوں پر	چھپا ہوا مرا قاتل مرے مکان میں تھا
کتنا پُر امن ہے ماحول فسادات کے بعد	شام کے وقت نکلتا نہیں باہر کوئی
مذہب سے میں نے مانگا تھا ماضی کا کچھ حساب	نیزوں پہ جھولتے ہوئے سر دے گیا مجھے
اب لہو صرف رگوں میں نہیں بہتا عشرت	دیر و کعبہ کے چراغوں میں بھی جل جاتا ہے
ٹھوکریں، زخم، لہو، دشت، سفر، پیاس، سراب	زندگی بھی ہے کسی جرم کا خمیازہ کیا
مرے ہاتھوں سے مٹا میری مشقت کے نشاں	اور پھر میری جبیں پر میری قسمت لکھ دے

شبیر اثر

فتح پور کے شعر و ادب پر مکالمہ ہو تو شبیر اثر سیکری کا نام اس مکالمہ میں پورے استحقاق کے ساتھ آئے گا۔ اثر صاحب ایک ٹیچر کی حیثیت سے ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۴ء تک فتح پور میں مقیم رہے۔ آپ کرشن پاٹھ شالہ میں اُردو کے ٹیچر تھے۔ فتح پور آنے کے بعد آپ نے شعر و ادب کا ماحول بنانے کیلئے جدوجہد کی۔ طرحی نشستوں کے اہتمام کے ساتھ ہی آپ نئے شاعروں کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کرنے لگے۔ عشرت دھولپوری نے جو تخم ریزی کی تھی، اثر صاحب کی کوششوں سے اُس کی قدرے آبیاری ہوئی۔ ماسٹر محمد شفیع سحر اور شوکت چوہان جذبی مطلع شعر پر اسی دوران نمودار ہوئے تھے۔

سیّد شبیر علی اثر مرحوم عبداللہ آزاد کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ۱۹۶۵ء سے شاعری کر رہے ہیں۔ غزل کے ساتھ ہی اکثر قطعات بھی کہتے ہیں۔ اساتذہ کی پیروی ان کے لیے مقدم ہے۔

گہرائیوں سے دل کی آئی ہے جو زباں تک　　اکثر وہی فغاں ہی پہنچی ہے آسماں تک
وہ مشکلوں میں تیرا کیا خاک ساتھ دے گا　　جس دوست کی رہی ہوں ہمدردیاں زباں تک

....

دنیا نہ دے مقام ہمیں اس کا غم نہیں　　ہم نازش زمانہ ہیں اے دوست کم نہیں
ہم وقت کے غلام نہیں ہیں جو بک سکیں　　ذرّوں کو آفتاب کہیں ان میں ہم نہیں

مرحوم عبداللہ آزاد

مرحوم عبداللہ آزاد سیکر کے ممتاز شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ بقول فائق الهندی "آزاد صاحب ماہ دو ماہ میں فتح پور ضرور تشریف لاتے۔ چند ایک احباب سے ملاقات کرتے۔ تازہ کلام سناتے۔ داد پاتے اور پھر ایک دو روز قیام کر کے چلے جاتے۔ برسوں فتح پور سے ان کا یہی تعلق رہا۔ اس وقت بھی جب فتح پور میں کوئی شاعر نمایاں نہیں ہوا تھا، اچھے شعر پر داد دینے والے موجود تھے۔ اس کتاب میں یہ بات الگ الگ طریقے سے متعدد مرتبہ لکھی جا چکی ہے۔ آزاد صاحب فتح پور کے صاحب ذوق اور پارکھ حضرات کو کلام سنا کر داد حاصل کرتے۔ آزاد صاحب سیکر کے ایسے شاعروں میں تھے جن کے تذکرے کے بغیر سیکر تو کیا راجستھان کے شعری دبستان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ وہ فطری شاعر تھے۔ ابھی تک ان کا مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔ قطعہ ؎

ہونے کو بلندی پہ خیالات بھی تھے   معلوم ترقی کے مقامات بھی تھے
سلجھا ہوا جتنا کہ ملا مجھ کو دماغ   اُلجھے ہوئے اتنے مرے حالات بھی تھے

آزؔاد صاحب نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ لیکن اپنے سلجھے ہوئے دماغ کی بدولت وہ ڈگری یافتہ لوگوں سے ممیتز تھے۔ درس و تدریس کے پیشے سے وابستگی نے ان کے شعور کو مزید جلا بخشی تھی۔ لیکن غربت نے کبھی ان کی دہلیز سے رشتہ نہیں توڑا۔ آزؔاد صاحب ہمیشہ اور ہر حال میں صابر و شاکر رہے۔ آپ کا تعلق سیکر کی نیلگر برادری سے تھا۔ غالباً یہ اپنی برادری میں پہلے شاعر تھے۔ آزؔاد صاحب نے آخری دم تک صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ ایک غزل کے چند اشعار

رہِ عشق سے ہوں میں بے خبر، کسی باخبر کی تلاش ہے
کسی ہمسفر کی ہے جستجو، کسی راہ بر کی تلاش ہے
میں کسی سے مانگ کے لوں خوشی، نہیں چاہتی یہ مری خودی
کہ عطائیں جس کی ہوں بے طلب، مجھے اس کے در کی تلاش ہے
تو دعا کی کہتا ہے شیخ اب، ہوئی ختم جب کہ حد طلب
میں دعائیں مانگ چکا بہت، مجھے اب اثر کی تلاش ہے

ہوتی نہیں قبول مقدر کی بات ہے   مایوس تو نہیں ہے دعا کے اثر سے ہم

پارس رومانؔ

نام محمودالحسن، تخلص پارسؔ۔ عشرتؔ دھولپوری کے فتح پور میں قیام کے دوران آپ عشرتؔ صاحب کی دعوت پر ایک بار فتح پور تشریف لائے تھے۔ یہ ۱۹۶۴ء کا زمانہ تھا۔ محلّہ بیوپاران کی جس حویلی میں عشرتؔ صاحب کا قیام تھا اسی کے بیرونی چبوترے پر مرحوم مولوی عبدالسمیع صاحب کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا تھا۔ آزادی کے بعد اسے فتح پور کا پہلا عوامی مشاعرہ کہا جائے گا۔ یہ مشاعرہ میرے لیے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اس مشاعرے سے پہلے میں نے کبھی کوئی مشاعرہ نہیں سنا تھا۔ اس مشاعرے کی صحیح تاریخ کا انداز نہیں لگ سکا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس مشاعرے کے دوسرے دن ہی میں نے اپنی زندگی کا پہلا شعر کہا تھا۔ پارس رومان نے اپنی مشہور نظم 'سائیکل گرل' سنا کر سامعین کو بہت متاثر کیا تھا۔ اس مشاعرے میں پہلی بار فتح پور کے شاعروں نے اپنا کلام پیش کیا تھا۔ یہ شعراء عشرت دھولپوری کی نگرانی اور رہنمائی میں تیار ہوئے تھے۔

پارس رومانؔ جودھپور میں مقیم ہیں۔ تذکرہ شعرائے جودھپور میں صفحہ نمبر ۸۰ پر آپ کا تعارف موجود ہے۔ اسی کے حوالے سے پارس صاحب کے چند شعر حاضر ہیں۔

نہ جیتے جی کبھی پوچھا نہ آئے قبر پر مری　　نہ جینا میرے کام آیا نہ مرنا میرے کام آیا

ٹھہر اے گردشِ دوراں کہ یہ رندوں کی محفل ہے
تجھے بھی گھول کر پی لیں گے جب گردش میں جام آیا

تجھ کو پاکر بھی کسی شئے کی تمنا ہونا　　میرے مسلک میں بڑا کفر ہے ایسا ہونا

ساتھ اغیار کے وہ آئے ہیں کاندھا دینے　　کوئی دیکھے میری میت کا تماشا ہونا

روئے تاباں پہ ترے زلفِ سیاہ کیا دیکھی　　کفر و اسلام کا دیکھا گیا یکجا ہونا

چاہے محشر ہو کہ دوزخ ہو کہ جنت پارسؔ　　میری وحشت کے لیے چاہیے صحرا ہونا

دلدارؔ ہاشمی

دلدارؔ ہاشمی کا نام شیخ عبد الرحیم ہے۔ آپ کی پیدائش ہبلی دھارواڑ میں ہوئی۔ اب تک آپ کی چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ آپ ۱۹۸۰ء میں پہلی بار نذیرؔ فتح پوری کی دختران کی شادیوں میں شرکت کی غرض سے فتح پور تشریف لائے تھے۔ آپ کی آمد پر درگاہ درِ دولت پر واقع محمد حسین کی ہوٹل کے سامنے ایک کامیاب عوامی مشاعرہ ہوا تھا۔ دوسری مرتبہ ۴؍ جنوری ۱۹۹۲ء میں تشریف لائے تو بزمِ شاہد کے دفتر میں ان کے لیے ایک اعزازی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ تیسری مرتبہ ۳؍ نومبر ۱۹۹۲ء کے ایک اعزازی مشاعرے میں صدر کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ یہ مشاعرہ منصور چوروی کے اعزاز میں ہوا تھا جس کی تفصیلات دوسرے صفحات پر درج ہیں۔ دلدارؔ ہاشمی کے چند منتخب اشعار۔

نقشِ پا سے اس لیے محروم ہے اپنی زمیں　　سب ہوا کے دوش پر ہیں کوئی بھی پیدل نہیں

جہاں میں ٹوٹے دلوں کا قرار میں ہی تھا　　سلگتے جسم تھے سب آبشار میں ہی تھا

جب تجھے دینا ہی ہے تو دے مسلسل غم مجھے　　پل میں آئے پل میں جائے یہ خوشی اچھی نہیں

جسے تم غم سمجھتے ہو کھلونا ہے مرے دل کا　　گزاری عمر ساری کر کے جس سے دل لگی میں نے

جو نہ کانٹوں سے گھری ہو وہ کلی اچھی نہیں　　اُلجھنیں جس میں نہ ہوں وہ زندگی اچھی نہیں

جب جم سکا نہ رنگِ سخن ان سے بزم میں　　دلدارؔ ہاشمی کو پکارا کبھی کبھی

احمد علی خاں منصور چوڑوی

منصور صاحب شیخاواٹی میں ایک اہم اور محترم شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ کی پیدائش ۲۲ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو چوڑو میں ہوئی۔ آپ نے زندگی کے اچھے اور برے سارے رنگ جھیلے ہیں۔ بچپن محنت مزدوری میں گزرا۔ آپ نے پولیس کے محکمہ میں بھی ملازمت کی۔ اس کے بعد درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہوئے اور ۱۹۷۷ء میں لیکچرار کے عہدے پر فائز ہو کر سبکدوش ہوئے۔ آپ اردو، ہندی اور مارواڑی تینوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ آپ نے ہر صنفِ سخن میں اپنی تخلیقی توانائی کے جوہر دِکھائے ہیں۔ آپ کی شاعری آپ کے مزاج کی مکمل ترجمانی کرتی ہے۔ فتح پور سے آپ کے دیرینہ مراسم ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں جناب لیاقت علی وقارؔ نے آپ کے لیے ایک اعزازی مشاعرہ کیا تھا۔ فتح پور میں متعدد مرتبہ آپ کا اعزاز ہو چکا ہے۔ فتح پور میں آپ کے شاگرد خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ فتحپور کے عوام میں بھی آپ ہر دلعزیز ہیں۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۶۷ء میں 'دار کی دعوت' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ دوسرا شعری مجموعہ ۲۰۰۰ء میں راجستھان اُردو اکادمی نے 'احساسِ انا گیر' کے نام سے شائع کیا ہے۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ کریں۔

مٹا رہے ہیں عنادل رسوم آزادی　　مگر چمن میں ہے گلچیں کا اقتدار ابھی

تمام دن کے سفر کی یہ نامراد تھکن　　حسین خواب دکھائے گی رات بھر مجھ کو

ہم بھی کسی تہذیب کے آثار ہوں جیسے　　پتھر پہ کھدے لفظوں کی مانند جیے ہیں

وہ خواب مرے تاج محل سے بھی حسیں تھے　　وہ خواب جو شیشے کی طرح ٹوٹ گئے ہیں

مرحوم سالک عزیزی

مرحوم سالک عزیزی کا نام فتح پور والوں ہی کے لیے نہیں بلکہ پورے راجستھان کے لیے ایک معتبر نام ہے۔ آپ نے زندگی بھر تالیف و تخلیق کا کام کیا۔ آپ کے ادبی کارناموں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ۱۹۹۰ء میں خورشید حسین خورشید نے 'ایک صورت ہزار آئینے' عنوان سے مضامین کا مجموعہ مرتب کیا تھا جس میں مرحوم سالکؔ کی شاعری، انشاء پردازی، تنقید و تحقیق، دینیات اور تعلیم و تدریس کے میدان میں ان کی بے مثال خدمت کا مختلف مضامین کے ذریعے احاطہ کیا گیا ہے۔ مرحوم سالک عزیزی کی زندگی ہی میں یہ کتاب چھپ چکی تھی۔

سالک عزیزی کی پیدائش ۵/ اکتوبر ۱۹۲۳ء مطابق ۲۳/ صفر ۱۳۴۲ھ بروز جمعہ راجستھان کے گلابی شہر جے پور میں ہوئی۔ آپ نے قرآن حفظ کیا تھا۔ آپ نے دنیوی تعلیم کی متعدد ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۵۵ء میں آپ کا تبادلہ جھونجھنوں کی ایک ہائی اسکول میں ہوا اور یہیں سے ۳۱/ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد آپ نے آخری لمحے تک اردو کی خدمت کا فریضہ انجام دیا۔ فتح پور میں آپ کی تشریف آوری اہالیانِ فتح پور کیلئے ہمیشہ مسرت کا باعث بنی رہی۔ غزلوں کے چند شعر ۔

خون دل اس میں جلا ہو تو غزل ہوتی ہے ۔۔۔ سانس شعلوں میں پلا ہو تو غزل ہوتی ہے

حاصلِ زیست کو ہاتھوں سے گنوا کر اے دوست ۔۔۔ کفِ افسوس ملا ہو تو غزل ہوتی ہے

کہنے والے نے اگر اپنی تمناؤں پر ۔۔۔ غازۂ خون ملا ہو تو غزل ہوتی ہے

گردشِ وقت کے ہاتھوں ارے سالک دل پر ۔۔۔ ہجر کا آرہ چلا ہو تو غزل ہوتی ہے

مستان بیکانیری

دین محمد مستان بیکانیری کے والد کا نام عبد الحنان تھا۔ مستان ۱۹۲۰ء میں بیکانیر کے ایک محلہ بھشتیان میں پیدا ہوئے۔ مستان صاحب نے باقاعدہ مکتبی تعلیم حاصل نہیں کی۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بناء پر راجستھان کے نمائندہ شاعروں میں اپنا مقام بنایا۔ غزل سے بڑھ کر آپ کی نظموں کے تذکرے تھے۔ آپ نظم کے شاعر کی حیثیت سے راجستھان بھر میں مشہور تھے۔ سامعین کے دلوں پر مستان صاحب حکومت کرتے تھے۔ آپ کی شاعری کا مجموعہ 'ہوش و مستی' ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۳/ دسمبر ۱۹۸۰ء کو بیکانیر میں آپ کو شہری اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ اس موقع پر بقول عبد العزیز آزاد "ایک آل انڈیا مشاعرہ' کیا گیا۔ جس میں آپ کو گیارہ ہزار روپے کی تھیلی، چاندی کی چھڑی اور سپاس نامہ پیش کیے گئے اور دستاربندی بھی کی گئی"۔

فتح پور شیخاواٹی میں بھی آپ بے حد مقبول تھے۔ ۱۶/ جولائی ۱۹۸۳ء میں اہالیانِ فتح پور کی جانب سے 'جشنِ مستان' منایا گیا تھا۔ سپاس نامے کے ساتھ آپ کو اکیس سو روپے کی رقم بھی پیش کی گئی۔ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو بیکانیر میں آپ نے دنیا کو خیر باد کہا اور آخری آرام گاہ کی جانب کوچ کیا۔ نمونۂ کلام

میرے قدموں کے پاکر نشاں دوستو ۔۔۔ راہ پر ہیں کئی کارواں دوستو

کعبہ ہوا، کلیسا ہوا، بتکدہ ہوا ۔۔۔ ساری جگہ ہے اپنا مصلیٰ بچھا ہوا

دنیا کا غم ہے قلب و جگر میں بسا ہوا ۔۔۔ سب کچھ ہے اپنے پاس خدا کا دیا ہوا

ترے در سے لینے والا، درِ غیر پر صدا دے وہ خطا کبھی نہ ہوگی جو کبھی ہوئی نہیں ہے

یہ عجیب ہے تری مصلحت، یہ عجیب تیرا نظام ہے
کہیں فکرِ گردشِ وقت ہے کہیں وقتِ گردشِ جام ہے
نہ تو رنج کر کسی بات کا کہ یہ فلسفہ ہے حیات کا
کبھی دھوپ ہے کبھی چھانو ہے، کبھی صبح ہے کبھی شام ہے

مخمور سعیدی

جناب مخمور سعیدی کا نام اور کام کسی رسمی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ کچھ لوگ علم و ادب کی تخلیق و ترویج ہی کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ مخمور صاحب ایسے ہی لوگوں میں ہیں۔ مختلف رسائل کی ادارت کے ذریعہ شعر و ادب کی قیادت وہ عرصۂ دراز سے کر رہے ہیں۔

راجستھان کے جدید شاعروں میں مخمور صاحب قد آور تخلیق کار کے طور پر اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ مخمور سعیدی کا تنقیدی مزاج بھی فطری ہے۔ ان کے متعدد شعری مجموعے اور مضامین کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ راجستھان اردو اکادمی کا سب سے بڑا حافظ محمود شیرانی ایوارڈ ۲۰۰۱ء میں ان کو مل چکا ہے۔ ہندوستان کی مختلف اُردو اکیڈیمیوں نے ان کی کتابوں پر انعام دیے ہیں۔ مخمور صاحب متعدد مرتبہ فتح پور کے مشاعروں میں شرکت فرما چکے ہیں۔ وہ جب بھی فتح پور تشریف لائے عوام نے انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔

مخمور صاحب مشاعروں کے کامیاب شاعر ہیں۔ کچھ ادبی رسائل نے ان کے فکر و فن پر وقیع گوشے بھی شائع کیے ہیں۔ مخمور صاحب کی غزل کا یہ مطلع عوام میں بہت مقبول ہے ۔

کتنی دیواریں اُٹھی ہیں ایک گھر کے درمیاں گھر کہیں گم ہو گیا دیوار و در کے درمیاں

مخمور سعیدی کی ایک نظم ۔

وقت کے قدموں کی آہٹ دیتی ہے سنائی ایسے سناٹے میں بھٹک رہی ہوں بیتی صدیاں جیسے
اک اک لمحہ ڈھونڈ رہا ہے کھوئی ہوئی رعنائی دوڑ رہا ہے پیچھے کو باوصف شکستہ پائی
راہ میں لیکن کچھ دیواریں آن کھڑی ہوئی ہیں ان سے سر ٹکراتے ہوئے لمحوں کے یہ پچھلے سائے
مملکت فردا کا رستہ کون انھیں دکھلائے

دوہے

ناؤ مری وہ اُلٹ گیا بیچ ندی کی دھار اور یہ مجھ سے کہہ گیا سوکھا اُتروں پار

رات امیر شہر کی محفل اور سنجاب اوڑھ کے ہم بھی سو گئے جھوٹے سچے خواب

شین کاف نظام

نظام کا تعلق راجستھان کے تاریخی شہر جودھپور سے ہے۔ غزل اور نظم کے وسیلے سے شین کاف نظام ایک معتبر نام ہے۔ علامہ کالی داس گپتا رضا نے انھیں جودھپور کا نظام الملک تحریر فرما کر بے پناہ داد سے نوازا تھا۔ نظام مشاعرے کی دنیا میں بھی ایک کامیاب شاعر اور ہر دلعزیز ناظم مشاعرہ کے طور پر اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ وہ تنقیدی بصیرتوں سے مالامال ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "لفظ در لفظ" ۲۰۰۰ء میں راجستھان اُردو اکیڈمی کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ شاعری کے مجموعے بھی شائع ہو کر ادبی دنیا میں وقار حاصل کر چکے ہیں۔

۲۰۰۰ء میں راجستھان اُردو اکیڈمی نے 'حافظ محمود شیرانی ایوارڈ' پیش کر کے آپ کے ادبی کارناموں کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

فتح پور کے دو بڑے مشاعروں میں وہ شرکت فرما چکے ہیں۔ اپنے سحر آگیں ترنم اور خوبصورت نظامت سے نظام صاحب فتح پور والوں کے دلوں کو فتح کر چکے ہیں۔ غزل کے چند اشعار

دونوں اطراف کے لوگ زخمی ہوئے پتھروں کی کہاں تھی کمی شہر میں

کتنا مایوس کتنا افسردہ ہے میری طرح شہر بھی تنہا

فرد باقی ہے خاندان کہاں ڈھونڈتے ہیں مکیں مکان کہاں

دوہے

گوبر سے گھر لیپ کر گوری ہوئی اُداس دہرائے گا کون کل آنگن کا اتہاس

پیت جھڑ کی رُت آگئی چلو آپنے دیس چہرا پیلا پڑ گیا دھولے ہو گئے کیس

شاہد رتلامی مرحوم

عبد الحکیم شاہد رتلامی کا تعلق اگرچہ رتلام ایم پی سے تھا لیکن فتح پور شیخاواٹی کے ادبی آسمان پر وہ ہمیشہ 'ابر بہار' کی مانند چھائے رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کویت میں شاہد صاحب کے قیام کے دوران

جب باشندگانِ فتح پور سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں اور ان کی صحبتیں میسّر آئیں تو شعر و سخن کا ذوق لوگوں میں پیدا ہو گیا۔ شاہد صاحب ایک اچھے شاعر کے ساتھ ساتھ اچھے انسان بھی تھے۔ ایک طرح سے وہ اپنے آپ میں محبتوں کے سفیر تھے۔ ان کی سادگی پسندی، نیک سیرتی نے لوگوں کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا اور پھر مرحوم جیون حیات کے علاوہ عنبر فتح پوری، نثار احمد راہیؔ، الیاس قمر، منصور نیّر، گوہر فتح پوری اور رفیق رازؔ فتح پوری اور ناز فتح پوری شاہد صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ اس طرح پہلے کویت میں شعر و سخن کی بنیاد پڑی اور اس پر سقف و بام کا کام فتح پور میں ہوا۔ شاہد رتلامی خود بھی فتح پور تشریف لا چکے ہیں۔ فتح پور میں بزمِ شاہد کا قیام ان کی زندگی ہی میں عمل میں آچکا تھا۔ عرصہ تک بزمِ شاہد کے تحت علمی ادبی اور شعری مجلسوں کا انعقاد ہوتا رہا۔ فتح پور میں شعر و ادب کا ماحول بنانے اور اس کو استحکام عطا کرانے میں مرحوم شاہد رتلامی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

شاہد رتلامی غزل کے شاعر تھے۔ کبھی کبھی نظم بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ اُن کی شاعری ان کی زندگی کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ جس خودی، خودداری، قناعت پسندی، صلح جوئی کے وہ حامل رہے اس کا عکس ان کی شاعری میں موجود ہے۔

شاہد رتلامی کا کلام نثار احمد راہیؔ کے شکریے کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے

غزل

یہ نہ سمجھو کہ رو رہا ہوں میں — دامنِ زیست دھو رہا ہوں میں
کل اُڑائی تھی نیند پھولوں نے — آج کانٹوں پہ سو رہا ہوں میں
بجھ نہ پائے جو تند آندھی سے ☆ ان چراغوں کی لو رہا ہوں میں
شدتِ درد سے تھیں آنکھیں بند — لوگ سمجھے کہ سو رہا ہوں میں
دل کی بنجر زمین پر شاہدؔ
پیار کے بیج بو رہا ہوں میں

غزل

آگ سے ربطِ محبت کو بڑھاتے کیوں ہو — موم کا جسم لیے دھوپ میں جاتے کیوں ہو ☆
میں تو مٹی کا گھروندہ ہوں بکھر جاؤں گا — جب بنانا نہیں آتا تو مٹاتے کیوں ہو
زنگ آلود ہے انصاف کی زنجیر ابھی — تم جہانگیر کی دہلیز پہ جاتے کیوں ہو
چھین لو وقت کے ہاتھوں سے مسرت کے چراغ — زندگی غم کے اندھیروں میں کھپاتے کیوں ہو

تم بھی ہو جاؤ گے بدنامِ زمانہ شاہدؔ
میری آواز میں آواز ملاتے کیوں ہو

راشدؔ ٹونکی مرحوم

صاحبزادہ راشد علی خان راشدؔ ٹونکی کے نام سے مملکت شعر و سخن میں اپنا نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ان کا فتح پور سے گہرا تعلق رہا ہے۔ وہ جب بھی فتح پور آتے فتح پور کے تشنگانِ شعر و ادب کو اپنے کلام اور ترنم سے خوب سیراب کرتے۔ راشد اگرچہ ٹونک کے بانی نواب امیر الدولہ سے پانچ پشتوں کا سلسلہ رکھتے تھے لیکن ان کی لااُبالی طبیعت نے انھیں ہمیشہ سرگرداں رکھا۔ اسی سیاحی میں راشد صاحب اکثر فتح پور کا رُخ کر لیا کرتے تھے۔ فتح پور میں ہفتوں ان کا قیام رہتا اور یہاں سے خوش اور خوشحال ہو کر لوٹتے۔

راشد کا انتقال ۴ر جون ۲۰۰۱ء کو ٹونک میں ہوا۔ فتح پور کے ادبی حلقوں میں ان کی موت کا سوگ منایا گیا۔ دیوڑا ہاؤس میں اکبر قاسمی کی صدارت میں مرحوم راشد کے مصرعے 'نہ دو طول اس لمحۂ مختصر کو' پر تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ جناب عنبرؔ فتح پوری نے مرحوم راشد ٹونکی کی شاعری اور فکر و فن پر مضمون پڑھا اور انھیں سہلِ ممتنع کا شاعر قرار دیا۔ راشد کی تعزیت کے لیے فتح پور کے شعراء ٹونک بھی گئے۔ وہاں جاکر اپنے کلام کے ذریعے راشد مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

مَرنے کے بعد بھی تری عزت وہی رہی

جناب نثار احمد راہیؔ کے حوالے سے مرحوم راشد ٹونکی کی دو غزلیں حاضر ہیں

☆

جب سے اک بے وفا کی کمی رہ گئی زندگی میں عجب تشنگی رہ گئی
کیا ٹھکانہ ہے زیبائشوں کا بھلا جب نظر ان کی جانب گئی، رہ گئی
ایک دلہن سنورتی رہی عمر بھر ایک دلہن سجی کی سجی رہ گئی
جام اُٹھاتے ہی ان کا خیال آگیا ایک بھی گھونٹ ہم نے نہ پی رہ گئی
جب وہ بدلے تو راشد خدا کی قسم ہاتھ مَلتی ہوئی دوستی رہ گئی

☆

چہرے پہ بکھر کر وہ گیسو جس وقت پریشاں ہوتے ہیں
پیشانیٔ کفر و ایماں پر کیا نقش نمایاں ہوتے ہیں

گر کر بھی ان اشکوں کی قیمت خوشیوں سے سوا ہو جاتی ہے
آنکھوں سے ٹپک کر جو آنسو، زیبائشِ داماں ہوتے ہیں

میں خود بھی برا ہو سکتا ہوں، قسمت بھی بری ہو سکتی ہے
کیوں آپ ہراساں ہوتے ہیں، کیوں آپ پریشاں ہوتے ہیں

وہ لوگ بھی کیا ہوں گے راشد دنیا جنھیں برسوں روئے گی
حالانکہ یہاں آنے والے کچھ روز کے مہماں ہوتے ہیں

ڈاکٹر فرآز حامدی

فراز حامدی ۱۲؍ جولائی ۱۹۴۶ء کو ٹونک میں پیدا ہوئے۔ ایم۔اے۔ کیا۔ درس و تدریس کے پیشے سے وابستگی رہی۔ آپ حضرت کیف بھوپالی کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ راجستھان میں گیت، دوہا، غزل، ماہیا اور مختلف اصناف میں آپ نے اپنی تخلیقی ہنر مندیوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ تخلیق کے ساتھ آپ تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں۔ اردو ماہیے کے فروغ اور ترسیل کے میدان میں آپ نے کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔ ماہیے پر جتنے مضامین ہندوستان میں آپ نے لکھے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ غزل، نظم اور ہائیکو پر بھی آپ کے مضامین انڈو پاک کے رسائل میں چھپ چکے ہیں۔

فراز حامدی کا نام واحد حسین خان ہے۔ والد ڈاکٹر حامد حسین خان۔ آپ راجستھان کے یوسف زئی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی زمانے میں مشاعروں کی دنیا میں آپ بے حد مقبول تھے۔ کسی وجہ سے آواز نے ساتھ چھوڑ دیا اور آپ مشاعروں کے ہنگاموں سے دور گوشہ نشین ہو کر کاروبار قرطاس و قلم میں مصروف ہو گئے۔ فتح پور سے آپ کی قلبی وابستگی ہے۔ آپ فتح پور آچکے ہیں۔ عنبر، عادل اور فراز صاحبان سے آپ کی مراسلت کا سلسلہ رہتا ہے۔ راقم الحروف سے بھی آپ کا برادرانہ رشتہ ہے۔

غزل

خواب ہوئی اک ایک تمنا پوچھو ہو افسانہ کیا
ہم کاغذ کے گلدستے ہیں کھِلنا کیا مُرجھانا کیا

یاد وہی گھڑیاں آئیں گی جن میں تیرا ساتھ رہا
جو رُت تیرے ساتھ نہ بیتی اس رُت کا دہرانا کیا

ہم نے کسی سے پیار کیا ہے، قصہ دل تو اتنا ہے
سیدھی سادی بات کو یارو! لفظوں میں اُلجھانا کیا

شہر کی بھیڑ میں سہمی سہمی کھوئی کھوئی سی ایک نظر
ہر چہرے سے پوچھ رہی ہے تو نے مجھے پہچانا کیا

ایسی بھی کیا بات ہے جس کا بوجھ لیے بیٹھے ہو فراز
جو کچھ دل پر بیتی کہہ دو یاروں بیچ چھپانا کیا

دوہا

آئینے کی سطح پر اشکوں کی سوغات پانی میں ہونے لگی تاروں کی برسات

فراز حامدی گوناگوں خصوصیات کے حامل ہیں۔ انڈوپاک کے معتبر رسائل میں آپ کی شاعری اور مضامین تواتر کے ساتھ شائع ہورہے ہیں۔ جاپانی اصناف ٹنکا اور رینگا کی تخلیق میں آپ نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ علاوہ ازیں تکونی، کہمن، منظومہ، محبوبہ جیسی نئی اصناف پر بھی آپ کے تنقیدی مضامین موضوع بحث بنے ہیں۔ صرف ماہیے جیسی صنف پر آپ نے ۵ ہزار سے زائد مضامین لکھ کر ماہیے کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو کی نئی اور پرانی بستیوں میں آپ کا نام اور ادبی کارناموں کا استقبال کیا جاتا ہے۔ دوہا غزل، دوہا گیت، ہری گیت جیسی اصناف کے آپ موجد ہیں۔ آپ کئی علمی، ادبی اور سماجی اداروں سے وابستہ ہیں۔ آپ کی حمد، نعت اور غزل گیت کے گرافون کمپنیوں نے ریکارڈ اور کیسٹ بنائے ہیں۔ گذشتہ ایک دہائی سے آپ نے اپنے آپ کو شعر وادب کی تخلیق، ترویج اور ترسیل کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ بی بی سی لندن نے ہندوستان کے جن دو تخلیق کاروں کے براہِ راست انٹرویو لیے ہیں وہ مناظر عاشق ہرگانوی اور فراز حامدی ہیں۔

فاروق انجینئر

محمد فاروق خان نزبان۔ والد ذوالفقار علی خان نزبان۔ ۱۵ر اگست ۱۹۶۰ء کو سیکر میں پیدا ہوئے۔ حکومت راجستھان کے بجلی بورڈ میں اسسٹنٹ انجینئر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ کا تعلق اگرچہ سیکر سے ہے لیکن فتح پور سے بھی کا خاص تعلق رہا ہے۔ متعدد مرتبہ فتح پور کے مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ راجستھان اردو اکیڈمی کی جانب سے ۹۸-۱۹۹۷ء میں آپ کو اعزاز مل چکا ہے۔ آپ کا شعری مجموعہ 'صحرا میں گم ندی' ۱۹۹۹ء میں چھپ کر منظر عام پر آچکا ہے۔ چونکہ ملازمت کے سلسلے میں دس سال آپ کا قیام کوٹہ میں رہا اس لیے تذکرہ شعرائے کوٹہ میں آپ کا ذکر موجود ہے۔ پچھلے آٹھ سال سے جے پور میں مقیم ہیں۔ غزل اور دوہے لکھتے ہیں۔ شاعری میں اپنے احساس کے حامی ہیں۔ رسائل میں کلام شائع ہوچکا ہے۔ 'صحرا میں گم ندی' سے چند اشعار نوٹ کیے جاتے ہیں!

گھر میں آئی ہے پھر جدید ہوا ہوگی اب کے تو کچھ مفید ہوا

دیر لگتی ہے کچھ مرے بکھرنے میں ہے ضرورت ذرا تری سے مزید ہوا

غم گھٹا جب بھی بلند کمرے میں یاد آئی تری شدید ہوا

وقت کے ساتھ جو چلا فاروق

ساتھ اپنی کے چلی عزیز ہوا

کتنی دیر اس میں مرا کردار ہے زندگی تیری کہانی کتنی دیر

جو چلی فاروق صحرا کی طرف اس ندی کی ہے روانی کتنی دیر

اظہار مسرت یزدانی

ڈاکٹر اظہار برسوں اپنے پیشے کے سلسلے میں فتح پور میں مقیم رہے۔ یہاں کے ادبی ماحول میں آپ نے اپنے آپ کو نمایاں رکھنے کی کوشش کی۔ آپ کے شعری مجموعے کی رسم اجراء بھی فتح پور ہی میں ہوئی۔ آپ غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ آپ کا شعری اور ادبی شعور سنجیدگی سے ہمکنار ہے۔ آپ ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ فتح پور میں آل انڈیا مشاعروں کی نظامت آپ کر چکے ہیں۔ آپ نے زندگی کے کئی نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ آپ کے تجربات کا رنگ آپ کی شاعری میں جھلکتا ہے۔

کتنے کم ظرف ہیں یہ اونچے مکانوں کے مکیں — اہل فٹ پاتھ کا سورج بھی چھپا دیتے ہیں

اس دور کشاکش میں ایثار و وفاداری — سوچیں تو حقیقت ہے، دیکھیں تو فسانہ ہے

ہمارے حصے میں صحرا کی تشنگی آئی — سمندروں میں بڑی مچھلیوں کا ڈیرا تھا

صبح ہوگی تو ملے گا یہاں ہر اک زخمی — رات برسے ہیں مرے شہر میں گھر گھر پتھر

آکے سیلاب گزر جائے گا لیکن برسوں — حاکم وقت نیا گھر نہ بنانے دے گا

ہر بزم میں تنہائی کا آسیب ہے، میں ہوں — ہر بزم کا ماحول مرے گھر کی طرح ہے

ملکہ نسیم

موجودہ زمانے میں خاتون شاعرات میں اُردو غزل کے حوالے سے ایک معتبر نام ملکہ نسیم صاحبہ کا ہے۔ ملکہ نسیم پچھلے ۲۵ برسوں سے رسالوں، کتابوں اور مشاعروں کی دنیا میں ایک ممتاز اور کامیاب شاعرہ کی حیثیت سے اپنی بھرپور شناخت بنا چکی ہیں۔ بیرونِ ہند مشاعروں میں شرکت ان کی عالمی شہرت کی مظہر ہے۔ مشاعروں میں جہاں مترنم شاعرات کا طوطی بولتا ہے۔ جہاں شعر کو کم اور ترنم

کو زیادہ داد ملتی ہے۔ وہاں ملکہ نسیم جیسی شاعرہ خالص شعر پڑھ کر داد وصول کرتی ہیں۔ یہ ایک اعزاز کی بات ہے۔

آپ کی شاعری کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ جس اعتماد کے ساتھ شعر پڑھتی ہیں، اسی انداز میں نظامت کے فرائض بھی انجام دیتی ہیں۔ فتح پور میں دو کتابوں کے اجراء کے جلسے کی نظامت کر کے آپ نے اپنی خداداد صلاحیتوں کا اظہار کیا تھا۔

فتح پور میں آپ دو مشاعروں میں شرکت فرما چکی ہیں۔ دونوں مشاعروں میں آپ نے خوبصورت اشعار پیش کر کے سامعین سے داد وصول کی تھی۔ نمونۂ کلام :

سلگتی شام کی دہلیز پر جلتا دیا رکھنا ہماری یاد کا خوابوں سے اپنے سلسلہ رکھنا
صدا بن کر، گھٹا بن کر، فضا بن کر، صبا بن کر نہ جانے کب میں آجاؤں دریچہ تم کھلا رکھنا

غــزل

کچھ وہ چہرے ہیں کہ آئینے سنور جاتے ہیں آئینہ دیکھ کے کچھ چہرے اُتر جاتے ہیں
سمتِ منزل قدم اُٹھتے ہیں ٹھہر جاتے ہیں حوصلے کانچ کی مانند بکھر جاتے ہیں
ہم جہاں رکھتے ہیں بنیاد مکاں کی اپنے برق وطوفاں انھیں راہوں سے گزر جاتے ہیں
پاس تم تھے تو زمانے کا کوئی خوف نہ تھا اب یہ عالم ہے کہ آہٹ پہ بھی ڈر جاتے ہیں
شدتِ غم میں تری یاد نہیں آپاتی کھولتے پانی میں سب عکس بکھر جاتے ہیں
سر اُٹھاتا ہے اگر ظلم تو ہے وقت گواہ اس سے ملنے کے لیے نیزوں پہ سر جاتے ہیں

حق کی آواز پہ لبیک جو کہتے ہیں نسیمؔ
اپنے دامن میں لہو لیکے وہ گھر جاتے ہیں

مرحوم شعراء

آفتابِ شیخاواٹی حضرت خواجہ حاجی نجم الدین فاروقی سلیمانی چشتیؒ

آپ کی ولادت باسعادت ۳ر رمضان المبارک ۱۲۳۴ھ کے دن بمقام جھونجھنوں ہوئی۔ (۲۲ جون ۱۸۱۹ء)۔ آپ کے والد محترم کا اسم گرامی خواجہ شیخ احمد بخش تھا، جو شیخ المشائخ سلطان التارکین خواجہ حمید الدین صوفی الفاروقی ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ خاص تھے اور خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے تھے۔

حضرت خواجہ نجم الدین صاحب کو چار پانچ سال کی عمر میں اپنے زمانے کے مشہور بزرگ مولانا محمد رمضان صاحب قادری مہمی نے بسم اللہ شریف پڑھاکر آپ کی تعلیم کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کے بعد آپ نے قرآن شریف ختم کیا۔ مولانا محمد رمضان قادری کے علاوہ آپ نے راجستھان کے مختلف علماء کرام سے علم حاصل کیا۔ آپ کی طبیعت ابتداء ہی سے ریاضت کی طرف مائل تھی۔ ظاہری علوم نے جب اپنا اثر دکھایا تو علم تصوف کے ساتھ ہی علم الادب اور فن شعر کا رنگ بھی آپ کی طبیعت پر غالب آنے لگا۔

آپ فارسی، اردو، ہندی اور شیخاواٹی ...... چاروں زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ مذکورہ چاروں زبانوں میں آپ نے اپنی تخلیقی قوتوں کے جوہر دِکھائے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ برج بھاشا پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ شاعری میں آپ کا انداز متانت اور سنجیدگی سے پُر دِکھائی دیتا ہے۔ ذیل میں آپ کے کلام کے سارے نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ فارسی کی ایک غزل ملاحظہ کریں:

الٰہی چوں جمال خود نمودی در جہاں پیدا — بعشقت مبتلا گشتند ہر سو عاشقاں پیدا

جمال دلبرم جلالِ خود نمودی در جہاں پیدا — ہمہ از نورِ تو گشتند این نار و جناں پیدا

گہے خود را نمائی در جمالِ ایں پری رویاں — گہے آئی بشکل عاشقانِ بے دلاں پیدا

گہے جلوہ کنی در شکلِ رندانِ خراباتی — گہے باشی بصورت عابدان و زاہداں پیدا

نمائی خویش را گاہے بشکل رہبراں کامل — گہے جلوہ کنی در صورت ایں گمرہاں پیدا

ہزاراں مسلماں کردی ز شکم کافراں ظاہر — ز بطن مومناں کردی ہزاراں کافراں پیدا

روی در بتکدہ گاہے بہ زنارے گلو کردہ — بتے باشی گہے خود را کنی پیر مغاں پیدا

بہر نماز خود بکف تسبیح و سجادہ نمادہ آگہ باشی بشکل مسجد آں پیدا
حدیث یار رب با زہی جرجمہ در کاہم کہ بینم کمال تو بشکل ایں بتاں پیدا
نجم غرق بجز جمال خود گمان خلق گر آید بمن باین و آن پیدا

اردو غزل میں بھی آپ کی فکر سخن پر تصوف کا اثر نمایاں ہے۔ غزلوں سے منتخب اشعار

اے دوست تیرے عشق نے دیوانہ کردیا سب اپنے خویش سے مجھے بیگانہ کردیا
باللہ ترے حسن کی خوبی اسے شمع یک بار دکھاتے ہی پروانہ کردیا
تسبیح ہزار دانہ جو رکھتا تھا ہاتھ میں وہ سب جلا کے ساکنِ میخانہ کردیا
کیا نئی شان دکھا کے مجھے دیوانہ کیا اور مے عشق پلا کے مجھے مستانہ کیا
واہ کیا جلوہ گری ہے تری اے حسن کے شاہ آپ تو شمع بنے اور مجھے پروانہ کیا
ہوگئے ہم بھی ہیں داخل ترے غمخواروں میں جیسے بڑھیا ہوئی یوسف کے خریداروں میں
یار تو کہتا ہے تو جنگل میں چل پاس سے ایسے رقیبوں کے نکل
آہ یہ دکھ ہے رقیبوں کا مجھے کام میں میرے یہ ڈالتے ہیں خلل

آپ کا جتنا ہندی کلام ہے سارے کا سارا راگ راگنیوں کی بنیادوں پر لکھا گیا ہے۔ بالخصوص راگ آساوری، راگ برج، راگ دیس، راگ جھنجوٹی قابل ذکر ہیں۔ یہ سارا کلام آپ نے اپنے پیرو مرشد خواجہ سلیمان تونسویؒ کو مخاطب کرکے سپردِ قلم کیا ہے، مثلاً

"نجم سلیماں شیام پیا کے من کو یہ کیسے سہاوت ہے"

آپ کے کلام میں کبت کی بھی اچھی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔

آپ کی ہندی شاعری میں دوہا خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ نے اپنے دوہوں کا عروضی نظام ہندی عروض کے مطابق ہی رکھا ہے۔ لیکن دوہے کی مروجہ ہیئت میں آپ نے تصرف کرکے اس کا نام دوھڑہ تجویز کیا ہے، مثلاً

دوارو ایت دئے باورے ارے اناڑی بید تو ناواقف مرض کا، یہ تو اندھا بھید
نجما چنگا ہو نہیں بن دیکھے دیدار دارو میرے مرض کی مکھڑا ہے دلدار

نجما جگ میں آگیا چیت مہینا خوب اب تک آئے نا پھر کے برہن کے محبوب
لوگو مت لائیو پردیسی سے پیت چھوڑ پرائے دیس میں بیٹھے آپ نچیت

حضرت خواجہ نجم الدینؒ کا تعارف ایک بسیط دستاویز کا متقاضی ہے۔ آپ شیخاواٹی میں ہی نہیں بلکہ راجستھان میں پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ آپ اردو بزم کے سب سے اوّل مسند نشین ہیں۔ آپ کی شاعری ہمیشہ پردۂ خفا میں رہی۔ اس لیے آپ کو شعر و ادب کے میدان میں وہ مقام نہیں ملا جس کے آپ مستحق تھے۔ آپ ہمیشہ ایک صوفی اور خدا رسیدہ بزرگ کی حیثیت سے مشہور و معروف رہے۔ اس لیے بیشتر تذکرہ نگاروں نے آپ کو نظرانداز کیا۔

آپ نے شاعری میں کسی کو اپنا اُستاد نہیں بنایا۔ یہ آپ کے فطری ذوق و شوق کا نتیجہ ہے۔ آپ مختلف اصنافِ سخن پر زبردست قوت رکھتے تھے۔ آپ کا کلام ایک کامل اور مکمل شاعر کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے کلام میں وہ سارے محاسن موجود ہیں جو ایک شاعر کو مستند بنانے کا جواز پیش کرتے ہیں۔

ایک مستزاد کے چند اشعار دیکھئے:

خنجر عشق سے تیرے میں دل افگار ہوا ...... جب سے دو چار ہوا
دشتِ ادبار میں مجنوں کی طرح خوار ہوا ...... جو ترا یار ہوا
چشمِ باطن ہی کہاں مجھ کو مرے ماہ لقا ...... تجھ کو دیکھوں میں ذرا
گرچہ جلوہ تیرا ہر کوچہ و بازار ہوا ...... تو ہی اظہار ہوا

خواجہ حاجی نجم الدینؒ کے تعارف کا قلمی مسودہ جو پیر عارف نجمی کے توسط سے ملا ہے اس کے صفحہ نمبر ۳ پر جو عبارت ہے وہ اس طرح ہے:

”وہ کونسی خوبی ہے جو آپ کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ اس پر تصوف اور اخلاق کی چاشنی سونے پر سہاگہ اور طعام میں نمک کا کام دیتی ہے۔ حسرت و یاس اور عبرت کے مضامین آپ بالخصوص جس اسلوب اور موثر انداز سے لکھتے تھے، وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ دَورِ اوّل میں آپ راجپوتانہ کے شاعروں میں اپنی نظیر آپ تھے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ آپ کی شاعرانہ حیثیت کسی شاعر سے حتی کہ ولی اورنگ آبادی اور نصرتی جو اس قدر مشہور ہیں، سے کسی طرح کم نہ تھی۔ آپ نے شیخاواٹی و راجپوتانہ میں اصلاح زباں کی طرف خاص طور پر توجہ کی اور اپنی اصلاحات پر شدت کے ساتھ خود بھی عمل کیا اور اپنی تربیت سے شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ قائم کردیا جو آپ کے قائم کردہ راستے پر چلا۔ حضرت نجم الدینؒ کی اصلاحات کو ان کے شاگردوں نے ادب کا ایک جزوِ اعظم بنادیا۔ آپ نے اُردو زبان کی اصلاح و ارتقا کے سلسلے میں جو شاندار کام کیے ہیں، تاریخ میں وہ سنہری حرفوں سے لکھنے کے قابل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک شیخاواٹی و راجپوتانہ میں اُردو آپ کے احسان سے کبھی اور کسی حالت میں سبکدوش نہیں ہوسکتی۔

آپ کی شخصیت محض ادبی کمال تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ تبلیغ کے سلسلے میں بھی آپ نے اردو زبان میں بڑی بڑی کتابیں تصنیف کیں جو روحانی تعلیم کی نشرواشاعت کے خیال سے نہایت سادہ اور سلیس زبان میں لکھی ہیں تاکہ مذہبی تعلیم سے بھی عوام اور خصوصاً نو مسلم حلقہ واقف ہو جائے۔"

ایک اطلاع کے مطابق آپ نے اس دنیائے رنگ و بو میں اپنی عمر عزیز کے صرف ۵۲ سال گزارے۔ اس مدت میں آپ نے اردو فارسی میں کل ملاکر ۵۲ر کتابیں لکھیں۔ اس سے آپ کی طبیعت کی روانی اور قلم کی جولانی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی سوانح حیات آپ نے مناقب الحبیب کے عنوان سے فارسی میں لکھی تھی جس کا اردو ترجمہ آپ کے فرزند مولانا مولوی محمد رمضان فاروقی نے کیا تھا جس کا پہلا ایڈیشن ۱۳۳۲ھ میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا جدید ایڈیشن ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا ہے۔ آپ کا دیوان فارسی، اُردو، ہندی "دیوانِ نجم" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ذکر و اشغال سے متعلق آپ کی ایک تصنیف 'پیو ملانی، غیر بھلانی' ۱۳۴۴ھ میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۳۵۶ھ میں آپ کی دوہوں کی کتاب 'بارہ ماہیہ نجم' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔ آپ ۱۲۵۰ھ میں اپنے پیر و مرشد خواجہ محمد سلیمان تونسویؒ کے حکم سے فتح پور شیخاواٹی تشریف لائے۔ یعنی جب آپ فتح پور آئے تب آپ کی عمر شریف صرف ۱۶ر سال کی تھی۔ مختلف کتابوں کے حوالے سے معلوم ہوا ہے کہ فتح پور میں آنے کے بعد سنکڑی گلی کی مسجد (جو محلہ چیجاران میں واقع ہے) میں آپ نے قیام کیا اور عبادتِ الٰہی میں مشغول ہوگئے۔ یہاں بیٹھ کر آپ لوگوں کو ہدایت فرمانے لگے۔ دھیرے دھیرے جب آپ کا حلقہ بڑھنے لگا اور عوام حاضر ہونے لگے تو آپ نے شہر چھوڑ ویرانہ آباد کیا اور شہر سے جنوب کی طرف سیکر کے راستے پر جنگل کے کنارے دو لکڑیاں گاڑ کر سایہ بنایا اور مصروفِ عبادت ہوئے۔

۱۸ر رمضان المبارک ۱۲۸۷ھ میں آپ نے دنیا سے پردہ فرمایا۔ اس وقت آپ جھونجھنوں ہی میں تھے۔ اس کے بعد وصیت کے مطابق آپ کے جسد خاکی کو فتح پور لاکر وہاں دفن کیا گیا جہاں آپ نے مسجد چیجاران سے آکر ڈیرہ جمایا تھا۔ اسی جگہ آج آپ کا مزار بصورتِ درگاہ موجود ہے۔ جہاں آپ کا عرس ہر سال ۱۸ر شوال سے شروع ہو کر ۲۱ر شوال کو ختم ہوتا ہے۔

آپ نے فتح پور کے نوابوں پر ایک کتاب 'فتح پور کے نواب' لکھ کر اپنے تاریخی مزاج کا ثبوت بھی دیا ہے۔ آپ کی تمام تصانیف کی از سر نو اشاعت کی ضرورت ہے۔

حاجی محمد نصیر الدین شاہ صاحب محدث فتح پوری

سجادہ نشین اوّل خانقاہِ معلیٰ

نصیر الدین صاحب، حضرت خواجہ نجم الدین چشتی شاہ ولایت فتح پور شیخاواٹی کے خلف اکبر و خلیفہ اعظم تھے۔ آپ کی پیدائش ۲۲ر جمادی الاوّل یوم چہار شنبہ ۱۲۵۲ھ مطابق بھادوا بدی نہم ۱۸۹۲ء کو جھونجھنوں میں ہوئی۔

"آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار حضرت خواجہ نجم الدینؒ سے حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی میں مقیم نواب مرزا مغل بیگ خان صاحب نقشبندی، مرید و خلیفہ حضرت عزت عبد اللہ شاہ صاحب بگڑی کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ وہاں آپ نے درس نظامی کی تمام منزلیں طے کیں اور علم فرع واصول، فقہ و حدیث و تفسیر و معانی، علم کلام، علم ادب میں کمال حاصل کیا۔ ۱۲۸۷ھ میں اپنے والد بزرگوار کے وصال کے بعد آپ نے سجادگی کی ذمہ داری قبول کی اور تشنگان علم و تصوف کے لیے چشمہ ہدایت بن کر اپنے فرائض کی تکمیل میں منہمک ہو گئے"۔

(بحوالہ قلمی دستاویز۔ از پیر عارف نجمی)

۱۲۹۷ھ میں آپ کا وصال فتح پور میں ہوا تو تونسہ شریف میں حضرت خواجہ اللہ بخش نے اظہار افسوس کیا اور فرمایا کہ مولوی نصیر الدین شاہ صاحب فتح پوری بڑے جنگی درویش تھے، ہمارے خاندان کے چراغ تھے۔ دس کامل مکمل درویش ایک طرف اور مولوی نصیر الدین ایک طرف"۔

آپ کی قبر درگاہ حاجی نجم الدین میں موجود ہے۔ آپ کی قبر پر آپ کے برادر صغیر نور احمد صاحب کا لکھا کتبہ موجود ہے۔ عبارت اس طرح ہے:

فخر پور نور و مہہ سلیمان نجم الدین

ناصر حاجی نصیر الدین آپ ہیں

یہ تحریر ۱۳۰۴ھ میں لکھی گئی تھی۔

تلاش بسیار کے بعد بھی آپ کا غزلیہ کلام دستیاب نہیں ہوا۔ ہفت روزہ فرمان کراچی، ۳۰ر اپریل تا مئی ۱۹۹۱ء، جلد نمبر ۳۲-۳۳ کے شمارے میں آپ کی ایک منقبت خواجہ نجم الدین شاہ ولایت فتح پور شیخاٹی کی مدح سرائی میں شائع ہوئی ہے:

خواجہ نجم الدین ہے دربار شاہانہ ترا　　دستگیر حال ہے خود فضل ربانہ ترا

فیض کا چشمہ جہاں میں تیرا جاری چار سو — دل سے مفتوں بن گیا ہر خویش و بیگانہ ترا
لطف ہے جب یار تجھ پر جان بھی کرتا نثار — ڈھونڈتا پھرتا ہے تجھ کو یار پروانہ ترا
ساغرِ وحدت کے میکش شاد ہو کر دیں دعا — حشر تک آباد رہوے یار میخانہ ترا

حضرت نور احمد صاحب فتح پوری

(فرزند حضرت خواجہ نجم الدین چشتیؒ)

آپ بتاریخ ۱۳ر محرم ۱۲۶۰ھ بمقام جھونجھنوں تولد ہوئے۔ شاہ ولایت شیخاواٹی حضرت خواجہ نجم الدین کے فرزندان میں آپ دوئم تھے۔ آپ نے ظاہری اور باطنی علوم اپنے والد محترم کی صحبت سے حاصل کیا۔ آپ کا شجرۂ نسب اجداد کی معرفت سے حضرت فاروق اعظم عمر بن الخطاب سے ملتا ہے۔ آپ اپنے والد محترم کے خلیفہ و مرید تھے۔ ابتداء میں آپ تعلیم و تدریس کے کام میں مشغول ہوئے۔ پھر اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے برادر کلاں حضرت مولوی نصیر الدین صاحب کے ساتھ درگاہ معلی اور خانقاہ میں مقیم ہو کر مصروف خدمت رہے۔ آپ نے اپنی عمر ہدایت اور ارشاد کے کام میں صرف کی۔ اور ۴ر ذی القعدہ ۱۳۰۷ھ کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہو کر دنیائے بقا کی راہ لی۔

آپ کی شاعری پر آپ کے خانقاہی ماحول کا اثر دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے برعکس آپ کی شاعری خوشیوں، دلنوازیوں اور دلفریبیوں میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ آپ نے ایک عام آدمی کے دلی جذبات اور قلبی واردات کا بے لاگ اظہار اپنی شاعری میں کیا ہے۔

اجی واہ تم گالیاں مت نکالو — یہ کیا گفتگو ہے زباں تو سنبھالو
خدا سے ڈرو ہوش میں آؤ صاحب — بھلا ایسی باتوں میں تم ہم سے کیا لو

تیری جدائی پیارے آفت دکھا رہی ہے — فرقت میں جان اپنی ہونٹوں پہ آ رہی ہے
راتوں مجھے رلایا، آنکھوں سے خوں بہایا — عاشق کو یاد تیری کیا کیا ستا رہی ہے
ہوش و حواس چھوٹا، صبر و شکیب چھوٹا — ترچھی نگاہ تیری کیا کیا نچا رہی ہے
اے صاحبو! تم میں جسے توفیق خدا دے — افسانہ مرا کوئی اسے جا کے سنا دے
خیر جو کچھ ہے تو ہے پر یہ تو کہہ — اپنا عاشق بھی پرانا یاد ہے
مثل پروانہ کے اپنے آپ کو — شمع رو تجھ پر جلانا یاد ہے

غــزل

تیرے کوچے میں جو آجاتے ہیں ہم　یار دھوکا خلد کا کھاتے ہیں ہم
ہجر میں تیرے نہیں بھاتا ہے کچھ　خونِ دل پیتے ہیں غم کھاتے ہیں
نیند سے چونکایا تیری یاد نے　جب کبھی بھولے سے سو جاتے ہیں ہم
کیا کہوں کچھ کہہ نہیں سکتا ہوں نورؔ　اس کی فرقت میں جلے جاتے ہیں ہم

مولانا محمد رمضان فاروقی

آپ حضرت خواجہ نجم الدینؒ کے تیسرے فرزند تھے۔ ظاہری و باطنی علوم سے آراستہ اور پیراستہ تھے۔ شیخاواٹی کے علاقے میں علوم عربیہ و فارسیہ میں اپنی نظیر آپ تھے۔ دانش و بینش میں یکتائے روزگار تھے۔ بہت سی عربی اور فارسی کتابوں کے مترجم اور 'فخر التواریخ' کے مصنف تھے۔ ۷ر صفر ۱۳۴۹ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ آپ کا مزار جھونجھنوں محلہ پیرزادگان اندرون درگاہ خواجہ مخدوم حسین ناگوری میں ہے۔ گنبد اور بارہ دری بنی ہوئی ہے۔ کلام پختہ اور قلبی واردات کے اظہار سے مملو ہے۔ جگہ جگہ تصوف کی جھلک بھی ملتی ہے۔

ظاہری شیریں بیانی اور ہے　یار سے سرِّ نہانی اور ہے
زاہدا واقف نہیں تو رمز سے　عاشقوں کی رازدانی اور ہے
سینکڑوں دیکھے جہاں میں خوبرو　پر ہمارا یار جانی اور ہے
عشقِ دنیا ہیچ ہے رمضاںؔ عزیز
موجِ ملک جاودانی اور ہے

رہتی ہے مرے سامنے دلدار کی صورت　بھاتی نہیں اک دم مجھے اغیار کی صورت
ہرگز نہیں ڈالے کسی دلبر پہ نگاہیں　جو دیکھ لے اک بار مرے یار کی صورت

....

دو روزہ زندگی پر اتنا مچل رہا ہے　اے مدعیٔ ناداں کیوں زہر اگل رہا ہے
کیسا غضب ہے دیکھو، کتنا ستم ہے لوگو　خوش ہو رہی ہے شمع پروانہ جل رہا ہے

خواجہ غلام سروؔر فتح پوری

نام محمد سرؔور۔ تخلص سروؔر۔ والد کا نام خواجہ غلام محمد نجم الدین۔ سلسلہ فاروقیہ چشتیہ سلیمانیہ۔ آپ ۱۴ر ذی الحجہ ۱۳۱۸ ہجری بمقام فتح پور شیخاواٹی پیدا ہوئے۔

چار پانچ سال کی عمر میں آپ کے والد محترم نے آپ کو بسم اللہ شریف پڑھا کر حصولِ تعلیم کی ابتداء کی۔ بعد میں مولانا مولوی حبیب اللہ پیشاوری سے آپ نے قرآن شریف کی تعلیم حاصل کی اور اردو فارسی کے علاوہ علم حدیث، فقہ اور علم نجوم حاصل کیا۔ ۱۳ر سال کی عمر میں آپ نے عربی اور فارسی کا خاطر خواہ علم حاصل کر لیا تھا۔

حصولِ تعلیم کے دوران ہی آپ نے شعر گوئی کے میدان میں قدم رکھ لیا تھا جس کا اظہار آپ نے خود ہی کیا ہے۔

ہوئے شاعر ہیں جامیؔ اور نظامیؔ نرالا ہے مگر انداز میرا
برس سولہ کا یا سترہ کا سن ہے سخن میں دیکھ لو اعجاز میرا

آپ ۱۹۲۸ء میں اپنے والد بزرگوار کے وصال کے بعد خانقاہ شاہ ولایت فتح پور کی مسندِ سجادگی پر جلوہ افروز ہوئے۔ شیخاواٹی میں آپ کے مریدین کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے بھی آپ مقبولِ عام کی سند رکھتے ہیں۔ آپ نے بھی اپنے جدامجد حضرت خواجہ نجم الدین نجمؔ کی طرح فارسی اور اردو کے علاوہ ہندی زبان میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ راگ راگنیوں سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ آپ کا دیوان 'دیوانِ خواجہ سرور' کے نام سے ۱۹۹۴ء عیسوی - ۱۴۱۵ ہجری میں بہت ہی دیدہ زیب انداز میں شائع ہو چکا ہے۔

محمد عثمان عارف نقشبندی مرحوم نے لکھا ہے:

"موجودہ کلام پچاس برس پرانا ہے۔ اس میں ترقی پسند اور جدید شاعری کی تلاش عبث ہے۔ البتہ معیاری کلاسیکل شاعری اپنے جملہ محاسن کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ زبان سلیس اور رفتہ، روزمرہ اور محاورہ، تشبیہات، استعارات، مستند اساتذہ کے انداز میں موجود ہے۔ کلام میں سادگی، گہرائی اور گیرائی، لطافت و بلاغت سے پُر یہ کلام براہِ راست دلوں میں اُترتا ہے۔ درد، اثر اور شعریت اس کا خاص جوہر ہے۔ شاعری میں دراصل جذباتِ لطیفہ اور خیالاتِ نفیسہ کا اظہار ہوتا ہے۔ صوفی شعراء کی شاعری کا یہ خاصہ رہا ہے"۔ (دیوانِ خواجہ سرور صفحہ نمبر ۱۷۔)

فارسی کلام کا نمونہ ملاحظہ کریں:

ماہے تمامے دارم بجامے ہنگامِ صبحے ہنگامے شامے
بر دوش مینا در دست جامے آمد نگارِ زنگ خرامے
ہنگامِ جلوہ روحِ تجلّے در بزمِ عالم جانِ نظامے
جانِ بہاراں روح لطافت صبح مسرت تسکینِ شامے
بر وقت خفتن عالم بہ تسکیں وز مست نرگس درہم نظامے
گاہے جہانے گاہے بجانے ایں ہم مقامے آں ہم مقامے

از من چہ پرسی سرورؔ کجائی
من ہم ندانم خود را مقامے

اردو شاعری میں بھی آپ نے غزل ہی کو ترجیح دی ہے۔ یہاں آپ کے دیوان سے غزلوں کے منتخب اشعار پیش ہیں۔ پہلے نعت کے دو شعر دیکھیں ۔

آفاق ہے ناواقفِ اسرار محمدؐ آئینۂ تحقیق ہے دیدارِ محمدؐ
یعقوب کی آنکھوں کی بصارت ہے یہی نام یوسف بھی ہے سو جاں سے خریدارِ محمدؐ

غزلیہ اشعار

دنیا ہی کا کچھ کام ہوا ہائے نہ دیں کا رکھا نہ مجھے اے دلِ ناشاد کہیں کا
دیکھو تو مجھے قہر کی نظروں سے نہ دیکھو طبقہ نہ الٹ جائے کہیں دل کی زمیں کا
او وعدہ فراموش تجھے یاد نہیں ہے میں بھی تیرے افسانے میں ٹکڑا ہوں کہیں کا

ہے عشق میں سرورؔ یہی تسلیم کے معنی
ہر نقش چمک اُٹھے تری لوحِ جبیں کا

قمریوں نے وجد میں آکر کہا حق سرہٗ باغ میں جب وہ قدِ رعنا خراماں ہوگیا
پا بجولاں کھینچ لایا حشر کے میدان میں میری گردن پر کسی کا بارِ احساں ہوگیا

....

ظلمت شبِ دیجور کی ہٹ جائے تو اچھا مہتاب جو بدلی سے نکل آئے تو اچھا
بیمار ترا مرتا ہے او شوخ ستمگر کوچے سے ترے ہو کے اجل آئے تو اچھا

....

کہا گیا ہے کہ دنیا میں کیا نہیں ملتا مگر کوئی دلِ بے مدعا نہیں ملتا

پتا نقوش سے نقاش کا نہیں ملتا مجھے خدائی میں سرور خدا نہیں ملتا
ہمیں نے دیکھ لیا ان کو بے نقاب کلیم تمہیں یہ بادۂ طاقت ربا نہیں ملتا
نگاہ نور کی موجوں میں کھوئی جاتی ہے نگاہ بھر کے انھیں دیکھنا نہیں ملتا

مجھے وہ شعر سے پہچان جائیں گے سرورؔ
کسی سے رنگ میرے شعر کا نہیں ملتا

وصلِ جاناں ہو تو ممکن ہے شفا ہوجانا چارہ گر کھیل نہیں میری دوا ہوجانا
سیرِ گلشن کو جو جاؤگے تو ہے راہ یہی میری تربت پہ بھی اے ماہ لقا ہوجانا

....

پہلے ظرف نگاہ پیدا کر پھر بقدر نظر تقاضا کر
ذوقِ توحید اور پریشانی خاطرِ منتشر کو یکجا کر
باہمہ ہو کے بے ہمہ کی تلاش ہو کے تنہا تلاشِ تنہا کر
ظرف اپنا دِکھا دیا تو نے بات بھی کھوئی ہاتھ پھیلا کر

ہاتھ مخلوق سے اُٹھا سرورؔ
خالقِ پاک پر بھروسہ کر

دیکھو کسی سے ذکر ہمارا کیا نہ جائے بعدِ فنا کہیں ہمیں رسوا کیا نہ جائے
احسان ہم پہ رشکِ مسیحا کیا نہ جائے اچھا ہمارے درد کو اچھا کیا نہ جائے
فرقت زدوں کی آنکھ لگی ہے ابھی ابھی محشر خرامِ ناز سے برپا کیا نہ جائے
آؤ جو فاتحہ کو دبے پاؤں آئیو آہٹ نہ ہو کہیں کوئی کھٹکا کیا نہ جائے

اس دل کی بے وفائی سے سرورؔ سمجھ گئے
دنیا میں اعتبار کسی کا کیا نہ جائے

خواجہ غلام سرورؔ فتح پوری صاحب کے دیوان میں تاریخی نظمیں میں کثرت سے موجود ہیں۔ آپ نے تاریخی مادّے اردو فارسی دونوں زبانوں میں پیش کیے ہیں۔ اس سے آپ کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ کہیں ایک واقعہ کے لیے عیسوی اور ہجری دونوں تاریخیں نظم کی ہیں۔ کسی ہمشیرہ یعقوب بن کے انتقال پر کہا ہے

سرِ حیرت اٹھا کر یوں کہا ملہم نے اے سرورؔ الٰہی بائی یعقوب بن کا مدفن قصر جنت ہو
۷ ۴ ۳ ۱ ۵

ڈپٹی نظام الدین صاحب کے انتقال پر ۔

ندا ہاتفِ غیب نے دی یہ سرورؔ ملی آپ کو راحتِ آخرت ہے
۷ ۳ ۹ ۱ ء

اے والد مرحوم خواجہ غلام نجم الدین کے مزار کی بارہ دری پر دو قطعے کہے:

لب ہاتف سے آئی صدا واہ واہ مشہدِ شیخ کامل پُر انوار ہے
۵ ۵ ۳ ۱ ھ

کہا ہاتف نے سرورؔ سالِ تاریخ آہاہا روضۂ خلد بریں ہے
۷ ۳ ۹ ۱ ء

کلامِ ہندی کے چند نمونے

گرو گیان کا بھید بکھانا برم گیان کے بید کو جانا
کھو کر آپا آپ کو جانا ہر کو ہر میں پایو جی
ساگر موج لہر منجدھارا بیڑا ٹیکے کیون ہارا
بوند سمندر تال کنارہ جل نے نام دھرایو جی

آپ کا وصال ۱۴ / ربیع الاول ۱۳۷۲ھ مطابق ۳ / دسمبر ۱۹۵۲ء کو شب میں ہوا۔ درگاہ حاجی نجم الدین کے کنویں والے حصے میں تدفین عمل میں آئی۔ مولانا مولوی عبد الرشید صاحب نادہلوی نے فارسی میں تاریخ نکالی تھی ۔

ندا در گوش از ہاتف رسیدہ بگوں جاں عازم خلدِ بریں شد
۲ ۷ ۳ ۱ ھ

حضرت حافظ محمد عیسیٰ صاحب عیسیٰ فتح پوری

حافظ محمد عیسیٰ صاحب ۹/ ذی الحجہ ۱۳۲۴ھ کو بمقام فتح پور شیخاواٹی پیدا ہوئے۔ آپ حضرت غلام سرور فتح پوری صاحب کے برادرِ صغیر تھے۔ آپ نے علوم ظاہرہ اور باطنہ کی تعلیم و ترغیب اپنے والد محترم حضرت خواجہ غلام نجم الدین صاحب کے سایۂ عاطفت میں رہ کر حاصل کی۔ مولانا غلام نجم الدین صاحب شاہ ولایت شیخاواٹی حضرت خواجہ حاجی نجم الدینؒ کے پوتے اور مسندِ سجادگی پر فائز تھے۔
حافظ عیسیٰ صاحب نے اپنے والد محترم غلام نجم الدین صاحب ہی کے دست مبارک پر بیعت کر کے

خرقۂ خلعت حاصل کیا۔ آپ کو اپنے والد محترم کی زندگی ہی میں تبلیغ دین اور سلسلۂ چشتیہ کے فروغ کے لیے ہندوستان بھر کا سفر کرنا پڑا۔ اس کے بعد آپ ۱۹۷۴ء میں پاکستان تشریف لے گئے اور بقول پیر عارف نجمی "کراچی میں رہ کر سلسلۂ نجمیہ، سلیمانیہ، فخریہ اور نظامیہ کی اشاعت اور فروغ میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ اور پھر مورخہ ۱۴ ربیع الاوّل ۱۳۸۹ھ مطابق ۲۱ مئی ۱۹۸۹ء بروز بدھ اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ آپ کا مزار میوہ شاہ دھوبی گھاٹ کراچی میں زیارت گاہ خلق اللہ ہے۔

آپ کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی۔ نعت شریف، منقبت کے علاوہ غزلیں بھی کہتے تھے۔ عیسیؔ تخلص فرماتے تھے۔ آپ کی ایک نعت ہفت روزہ فرمان کراچی کے حوالے سے پیش کی جاتی ہے۔ غزلیہ کلام دستیاب نہ ہو سکا۔

عشقِ رسولؐ دل سے مٹایا نہ جائے گا — الفت کا یہ مکان گرایا نہ جائے گا
کہتا ہے قطرہ اشک کا گر گر کے اس طرح — کیا رحم میرے حال پہ کھایا نہ جائے گا
چل کر نسیم صبح یوں ہر گل سے کہتی ہے — بادِ خزاں سے باغ جلایا نہ جائے گا
اب تو اسے وصال کا مژدہ سنایئے — عیسیؔ سے بار ہجر اُٹھایا نہ جائے گا

مذکورہ نعت میں مطلع کے بعد یہ شعر درج ہے

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خنداں زن — پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

مگر پیر عارف نجمی نے اسے حذف کرادیا۔

حضرت خواجہ محمد حنیف

حضرت خواجہ محمد حنیف بن خواجہ عبداللطیف۔ آپ اپنے والد بزرگوار سے مرید تھے اور انھیں کے خلیفہ تھے۔ والد کے انتقال کے بعد آپ سجادہ رہے۔ آپ صاحب علم، شاعر اور باکمال بزرگ تھے۔ آپ کی زود گوئی اور لسانی ادراک کا یہ عالم تھا کہ آپ نے ہر زبان میں ایک ایک دیوان تصنیف کیا ہے۔ آپ کی نسبت شیخ فاروقی ہے۔ ۱۲۸۸ھ میں آپ پیدا ہوئے اور ۸ جمادی الاوّل ۱۳۴۷ھ میں انتقال کیا۔ آپ کے تعلق سے مزید کوائف معلوم نہ ہو سکے۔ غزل کے چند اشعار ؎

آدم کو ملک کہتے تھے کیا خاک بنے گا — سمجھے نہ کہ سر تا بہ قدم ادراک بنے گا
ہو خاک نشیں حاکم افلاک بنے گا — یہ عرش نشیں بندۂ لولاک بنے گا
تھی خاک سمجھ ان کی کسی نے نہ یہ سمجھا — آدم دم حق سے نفسِ پاک بنے گا

ہوئے گا کوئی دم میں یہ مسجودِ ملائک　　یہ خاک نشیں حاکمِ افلاک بنے گا
اولاد سے ہوئے گا اسی کے وہ پیمبر　　جو صلی علیٰ صاحبِ لولاک بنے گا
سیرت میں حنیف عرش نشیں ہوگا کبھی تو　　صورت میں اگر یہ خس و خاشاک بنے گا

(بحوالہ کشف الغطاء۔ صفحہ نمبر ۴، مؤلف معین الدین شاہ جودھپوری۔ ۱۳۵۶ھ)

شیخ ابراہیم خیالؔ فتح پوری مرحوم

نام: شیخ ابراہیم۔ تخلص: خیالؔ۔ آپ ۱۹۲۲ء کو راجستھان کے مہو شہر میں پیدا ہوئے۔ آپ کا انتقال ۱۹۹۸ء میں بمبئی میں ہوا۔

خیالؔ صاحب کے والد کاروباری سلسلے میں ممبئی آگئے تھے۔ خیالؔ صاحب کے بچپن ہی میں ان کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ نئی ماں ان کو سگی ماں سے بڑھ کر چاہتی تھی۔ ابتداء میں خیالؔ صاحب بیگ محمد ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ پھر انجمن اسلام ہائی اسکول، بوری بندر میں ۱۹۳۸ء میں جماعت پنجم میں داخلہ لیا۔ جہاں ڈاکٹر اسعد گیلانی مرحوم سابق امیر جماعت اسلامی لاہور اور مشہور ناقد اور شاعر ڈاکٹر عصمت جاویدؔ مرحوم ان کے ہم جماعت تھے۔ تینوں میں گہری دوستی تھی۔ ڈاکٹر عصمت جاوید ان دنوں ممبئی میں مقیم تھے۔ خیالؔ صاحب اور وہ ایک ہی محلہ میں مقیم تھے۔ دونوں روزانہ ایک ساتھ پیدل اسکول جاتے اور شام میں پیدل ہی لوٹتے۔ خیالؔ صاحب نے ماہر عربی دانوں سے عربی سیکھی اور اس میں مہارت حاصل کی۔

دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد ہندوستان میں گرانی کا ایک زبردست ریلا آیا تھا جس نے ہندوستانی معیشت کو درہم برہم کر دیا تھا۔ خیالؔ صاحب کو اعلیٰ تعلیم کا خیال ترک کر کے ملازمت کرنی پڑی۔ عربی کے ساتھ ہی ان کی انگریزی بھی اچھی تھی۔ اس لیے ایک مترجم کی حیثیت سے انھیں کویت میں ملازمت مل گئی۔ لیکن اختلاجِ قلب کے عارضہ کی وجہ سے وہ زیادہ دنوں تک کویت میں ملازمت نہیں کر سکے۔

ممبئی آنے کے بعد جب انھیں اختلاجِ قلب کے عارضے سے نجات ملی تو دوبئی کے محکمۂ آتش فرو (فائر بریگیڈ) میں سرکاری ملازمت مل گئی۔

خیالؔ صاحب کا تعلق فتح پور کی بیوپاریان برادری سے تھا۔ وہ تعلیم یافتہ تھے۔ خوش پوش بھی تھے۔ اس لیے اپنی برادری میں "اپ ٹوڈیٹ" کہلاتے تھے۔ عام طور سے وہ ابراہیم اپ ٹوڈیٹ کے نام

سے پہچانے جاتے تھے۔ فتح پور میں ان کا قیام بہت ہی کم رہا۔ شادی بیاہ یا موت، غمی کی رسموں میں شرکت کے لیے دو چار دن کے لیے فتح پور آجاتے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کا تعلق برادری میں کم تھا۔ وہ اسلامیات میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور شاعری میں اقبال کے عاشقِ زار تھے۔ اقبال کے سینکڑوں فارسی اور اردو اشعار زبانی یاد تھے۔ ترقی پسند شعراء میں فیضؔ کے اسلوب کو پسند کرتے تھے۔
خیالؔ صاحب نے شعر بھی کہا اور ادبی نثر بھی لکھی۔ انھوں نے اقبال کے چند فارسی قطعات کو جو لالۂ طور کے زیرِ عنوان 'پیامِ مشرق' میں شامل ہیں، اردو نظم کا لباس بھی پہنایا ہے، جو بمبئی کے ادبی رسالے 'دورِ حیات' کے ۱۹۶۳ء کے شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔

نہیں معلوم کیا شئے ڈھونڈتا ہوں چمن میں مَیں پریشاں مثلِ بُو ہوں
بر آئے آرزو یا بر نہ آئے شہیدِ سوز، سازِ آرزو ہوں

....

تو مشتِ خاک سے پیدا کر اک تن تنِ محکم کو جو سنگِ گراں ہو
پھر اس تن میں بنا درد آشنا دل ندی جیسے پہاڑوں میں رواں ہو

....

نہیں واقف میں مرغانِ چمن سے کہ تنہا چہچہانا میری خو ہے
اگر نازک ہے دل تیرا تو مت سن مری آواز میں شامل لہو ہے

غزلوں کا یہ انداز تھا۔

خدائی سے پھر کر رہے گی خدائی اگر بندگی دے رہی ہو دہائی
ہے دل میں بھی آکر پرائی پرائی مسرت سے ہے سرسری آشنائی
نہ کرتی مری گمرہی رہنمائی تو زاہد میں ہوتی کہاں پارسائی
کہتی ہے یہ کسی کی نظر ہائے دلنواز آنا ہے گر تو آؤ درِ میکدہ ہے باز
جنھیں خبر ہی نہیں سوزِ عشق کیا شئے ہے پرائی آگ میں ہرگز وہ جل نہیں سکتے
بڑی تیزی سے آنے والا جاتا بھی ہے تیزی سے مگر آتا ہے پختہ انقلاب، آہستہ آہستہ

خیالؔ صاحب نے افسانے بھی لکھے، کچھ تبصرے بھی تحریر کیے۔ نثر میں ان کی ایک کتاب 'ڈاکٹر عصمت جاوید ...... شخص، شاعر اور نقاد' شائع ہو چکی ہے۔
کینسر کے مہلک مرض کی وجہ سے ۳۰؍اپریل ۱۹۹۸ء کو ممبئی میں انتقال کیا۔

(ڈاکٹر عصمت جاوید کے حوالے سے)

غلام سرورؔ وفاؔ فتح پوری مرحوم

وفاؔ صاحب ۱۹۱۸ء کی کسی نیک ساعت میں پیدا ہوئے۔ آپ کی جائے پیدائش فتح پور شیخاواٹی ہے۔ آپ کا بچپن فتح پور ہی میں گزرا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم فتح پور کے کسی مدرسے میں حاصل کی۔ وفاؔ صاحب کے والد فتح پور سے ہجرت کر کے بیکانیر سکونت پذیر ہوگئے۔ بقول عزیز آزاد:

"آپ کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ بیدلؔ صاحب، عارفؔ صاحب، غازیؔ صاحب اور مستانؔ صاحب کی صحبت میں رہنے سے یہ ذوق و شوق دن بدن پروان چڑھتا گیا"۔

(بحوالہ تذکرہ شعرائے بیکانیر، صفحہ نمبر ۷۸)

وفاؔ صاحب کے خاندان اور کاروبار کے تعلق سے خورشید احمد قادری رقمطراز ہیں:

"وفاؔ فتح پوری ثم بیکانیری کا نام غلام سرور تھا۔ وہ فتح پور کے مشہور پیر اور عالم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے خاندان کے لوگ درگاہ درِ دولت فتح پور شیخاواٹی کے سجادہ نشین تھے۔ وہ وہیں پیدا ہوئے مگر اپنے والد پیر عبدالکریم صاحب کے ہمراہ بیکانیر تشریف لے آئے۔ والد مرحوم نے بیکانیر میں صرّاف کا کاروبار شروع کیا تھا جو کامیاب رہا"۔

(بحوالہ اسباق پونہ شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۰ء ص:۴۶-۴۵)

وفاؔ صاحب مشاعروں کے کامیاب شاعر تھے۔ طنز و مزاح میں ڈوبے وفاؔ صاحب کے قطعات سامعین کے ذوقِ سماعت کو نہال کردیا کرتے تھے۔ وہ اکثر فی البدیہہ شعر کہتے تھے۔ ان کے متعدد قطعات کے ساتھ کوئی نہ کوئی داستان موجود ہے۔ چند قطعات ملاحظہ کریں، محاوروں کا خوبصورت استعمال اسے کہتے ہے۔

دلِ بیمار دِکھاتے ہو یہ کیا کرتے ہو ڈاکٹر ہو کے ستاتے ہو یہ کیا کرتے ہو
میں تمھیں آنکھ دِکھانے کیلئے آیا تھا تم مجھے آنکھ دِکھاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

....

بات کی بات میں یوں بات نکل آتی ہے جب کوئی کہتا ہے میں بات بڑی کردوں گا
ہائے وہ جس کو نہیں کھاٹ پہ سونے کی تمیز وہ بھی کہتا ہے کہ میں کھاٹ کھڑی کردوں گا

....

تھا کبھی شوخ اداؤں کے سہارے جینا رہ گیا اب تو دواؤں کے سہارے جینا
زندگی اب مجھے اس موڑ پہ لے آئی ہے جہاں رہتا ہے دعاؤں کے سہارے جینا

غـــزل

یہ فسانہ ہے وفا کی شومیٔ تقدیر کا مٹتے مٹتے مٹ گیا ہے نقش بھی تصویر کا

یہ خلاصہ ہے ہمارے عشق کی تحریر کا ایک عنواں بن گیا ہے حسنِ عالم گیر کا

درد سینہ میں، خلش دل میں، جگر میں چٹکیاں واہ کیا اچھا نشانہ ہے تمہارے تیر کا

ہر ادا توبہ شکن وہ، اور یہ خاموش حسن تجھ سے ملتا ہی نہیں نقشہ تری تصویر کا

آپ کی بخشش ہے یہ یا آپ کا انعام ہے میں جو مالک ہو گیا ہوں درد کی جاگیر کا

آج تک دیکھا نہیں جس نے وفاؔ کو دیکھ لے

آئینہ ہے غم کی جیتی جاگتی تصویر کا

۸ر دسمبر ۱۹۹۱ء کو بیکانیر میں وفاؔ صاحب اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

ممدو آوارہؔ

نام محمد بخش۔ تخلص آوارہؔ۔ ممدو بھونکلے والے کے نام سے مشہور تھے۔ فتح پور کے امام باڑہ کے پیچھے گھر تھا جہاں آج بھی ان کے خاندان کے لوگ آباد ہیں۔ سفید قمیص، سفید تہہ بند، سفید کپڑے کی ٹوپی اور سفید داڑھی۔ سادہ طبیعت، سادہ مزاج، صبر و قناعت کی زندگی، شکر و استغناء کی مکمل تصویر۔ اگر محلہ میں کسی کا بچہ گم ہو جاتا، کسی کی بکری چوری ہو جاتی، کہیں کسی عالم دین کی تقریر ہوتی یا کوئی مذہبی جلسہ منعقد ہوتا تو اس وقت ممدو بھونکلے والے کی یاد آتی۔ صرف ایک روپے محنتانے کے عوض پورے محلہ میں وہ اپنے بھونکلے سے آواز لگاتے پھرتے۔ میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ میں نے متعدد مرتبہ رک کر اور سنجیدگی کے ساتھ ممدو بھونکلے والے کی ہانک سنی ہے۔ ۱۹۵۵ء کے آس پاس کا زمانہ تھا تب ممدو صاحب کی نعتوں کا گلدستہ 'جذباتِ آوارہ' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ صرف ۲۴ر صفحات کی کتاب تھی جس کی قیمت غالباً ایک آنہ تھی۔ اس وقت میلاد شریف کی محفلوں میں شرکت اور نعت شریف سنانے کی بڑی خواہش رہا کرتی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے یہ گلدستہ خریدا تھا۔ آوارہ صاحب کے مجموعے کی پہلی نعت اکثر میلاد کی محفلوں میں پڑھی جاتی تھی۔

نبیؐ کے پاک روضے کے لیے حسرت تڑپتی ہے

تمنا پوری ہو یا رب مری کمزور ہستی ہے

'جذباتِ آوارہ' کی ایک کاپی میری فائل میں موجود ہے۔ اس پر تاریخ اشاعت درج نہیں ہے

لیکن اتنا وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ۱۹۵۵ء سے پہلے کی تصنیف ہے۔

"جذباتِ آوارہ" اگرچہ فن کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتی لیکن یہ کیا کم ہے کہ آوارہ صاحب نے اس وقت شعر کہے جب فتح پور میں شعر وادب کے نام سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ عوامی سطح پر شعر و سخن کا کوئی ماحول نہیں تھا۔ 'جذباتِ آوارہ' کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ درگاہ حاجی نجم الدین سے منسلک تصانیف سے ہٹ کر اگر دیکھا جائے تو فتح پور میں اُردو شاعری کی یہ پہلی کتاب ہے۔

آوارہ صاحب میں جوہر شاعری موجود تھا۔ اگر اس وقت انھیں بہتر ماحول میسّر آتا یا کسی قابل اُستاد کی رہنمائی انھیں مل جاتی تو آوارہ صاحب ایک اچھے اور کامیاب شاعر کے طور پر ادبی حلقوں میں یاد کیے جاتے۔ جذباتِ آوارہ میں نعت، منقبت اور قصائد کے علاوہ مخمس بھی شامل ہیں۔ آخری صفحہ پر چار غزلیں ہیں لیکن ان میں بھی نعت کا رنگ غالب ہے۔ غزلوں کے چند شعر ؎

عاشق و معشوق دو ہیں عشق کا گھر ایک ہے ۔۔۔ ہے جدا شانیں بتوں کی پھر بھی پتھر ایک ہے

قیس اور لیلیٰ اگر دو نام سے منسوب ہیں ۔۔۔ دل جلوں سے پوچھیے شعلۂ اخگر ایک ہے

دوسری غزل کے تین شعر ؎

نہ دیکھا جو کہ کعبہ و کلیسا اور مندر میں ۔۔۔ وہ دیکھا بالیقیں اس یار کے پُر فیض منظر میں

ادائیں ذبح کی وقتِ ذبح ذابح کی اتنی تھیں ۔۔۔ شہیدِ ناز کو نیند آگئی آغوشِ خنجر میں

معطر جس قدر ان کی وفائیں ہیں دلِ عشاق ۔۔۔ نہیں ممکن فزوں اس سے ہو خوشبو مشک و عنبر میں

دو شعر

ترے کوچے میں ہو جائے اگر مدفون کی تجویز ۔۔۔ تو ہو ممنوعِ احساں جسم کا ہر اک عضو میرا

ترے مقتولِ ہجراں سے ہر اک شئے لطف اُٹھائے گی
بہار باغ عالم بن کے نکھرے گا لہو میرا

انتقال سے قبل آوارہ صاحب نے اپنی غیر مطبوعہ نعتوں کا ایک مختصر سا مسودہ غلام حسین خان جوڈ کے سپرد کیا تھا۔ قطر سے لوٹتے وقت جوڈ صاحب نے وہ مسودہ نثار مولے خان پڑھیار کو سونپ دیا تھا۔ برسوں بعد ۲۰۰۰ء میں پڑھیار صاحب نے وہ مسودہ میرے حوالے کر دیا جو میرے پاس محفوظ ہے۔ اس مسودہ میں بھی آوارہ صاحب کا نعتیہ کلام شامل ہے۔ آوارہ صاحب کی زبان سادہ تھی۔ اشعار میں عقیدت اور محبت کا رنگ غالب ہے۔

منوّر (منور علی سیّد)

منور علی سیّد کے والد کا نام مولانا علاء الدین سیّد تھا۔ منور صاحب کی پیدائش ۱۹۳۸ء میں شیخاواٹی کے ایک مقام بیسواسیکر میں ہوئی۔ تعلیم مکتب کے درجے سے آگے نہیں بڑھی۔ آپ پیشے کے اعتبار سے خیّاط تھے۔ ۱۹۵۹ء میں شاعری کا آغاز کیا اور رشید جے پوری سے کلام پر اصلاح لینے لگے تھے۔

منور صاحب نے اپنا کلام کبھی کسی کو نہیں سنایا۔ وہ اقبالؔ کے دیوانے تھے۔ کپڑوں میں بخیہ گری کرتے کرتے بھی "شکوہ اور جوابِ شکوہ" کا ورد زبان پر جاری رہتا۔ فتح پور بازار میں سبزی منڈی کے باہر دکان لگاتے تھے۔ اردو شاعری سنا سنا کر بازار میں اردو کے لیے ایک اچھا خاصہ ماحول بنالیا تھا۔ ۱۹۷۵ء کے آس پاس میں نے خود بنیوں، برہمنوں اور جاٹوں کو منور صاحب کی زبانی علامہ اقبالؔ کے اشعار سنتے اور سر دھنتے دیکھا ہے۔ شعر پڑھتے وقت خود پر رقّت طاری کرلیا کرتے اور کبھی کبھی تو بچوں کی طرح رونے لگ جاتے۔ عجیب جذب و مستی اور کیف و سرور کا عالم ان پر چھایا رہتا۔ برسوں منور صاحب نے فتح پور کے بازار میں اردو شاعری کی شمع فروزاں رکھی۔ اس وقت فتح پور میں تخلیقِ شعر کا کوئی ماحول نہیں تھا۔ کہیں کوئی شاعر دِکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایسے میں منوّر صاحب کا وجود ایک طرح سے اردو کی علامت بن کر رہ گیا تھا۔

منوّر صاحب کی زندگی بے حد عسرت اور کسمپرسی میں گزری، بے اولاد رہے۔ گھر کی دہلیز سے انھیں کبھی کسی نشاط پرور مسرت کا پیغام نہیں ملا۔ مرحوم نے کبھی حالات سے سمجھوتہ بھی نہیں کیا۔ اپنی ہی فکروں کے ساتھ زندگی بتائی۔ صفِ اوّل کے کاریگر تھے لیکن طبیعت کے لااُبالی پن نے کبھی حالات کو سنورنے کا موقع نہیں دیا۔ آخری عمر میں ٹھیلے پر کیلے فروخت کرتے تھے۔ علامہ اقبالؔ کے اشعار سنانے والا کیلوں کی تعریف میں ہانگ لگانے پر مجبور ہو گیا تھا۔

منوّر صاحب کی ایک غزل دستیاب ہوئی ہے۔

دنیا کے ہر فریب سے دامن بچالیا ممکن نہ تھا مگر اسے اپنا بنالیا
میری نظر پہنچنے نہ پائی تھی راز تک یہ کس نے آج رازِ حقیقت چھپا لیا
اب لاکھ گردشیں ہوں نظر میں تو غم نہیں ہم نے جمالِ یار نظر میں بسا لیا
موسیٰ سے طور پر بھی نہ دیکھا گیا جمال یہ کس نے آج بارِ امانت اُٹھا لیا
جس کی ضیاء سے آج منوّر ہے دو جہاں اس مہ لقا کو حق نے گلے سے لگا لیا

حیاتؔ (محمد جیون)

مرحوم محمد جیون حیاتؔ کی پیدائش فتح پور شیخاواٹی میں ہوئی۔ حیاتؔ صاحب کے والد کاروبار کے سلسلے میں مہاراشٹر کے شہر پونہ ہجرت کر گئے تھے لہٰذا حیاتؔ صاحب نے پونہ ہی میں تعلیم حاصل کی اور پھر اپنے والد کے ساتھ عمارت سازی کے کاروبار میں لگ گئے۔ والد کے انتقال کے بعد جب کاروبار متاثر ہوا اور مصائبِ زندگی نے آگھیرا تو حیاتؔ صاحب نے کویت کی راہ لی، وہاں فتح پور کے احباب میں پہلے ہی سے شعر و ادب کا ماحول تھا۔ مرحوم شاہد رتلامی کی رہنمائی میں حیاتؔ صاحب نے بھی شعر و ادب کے میدان میں اپنے جوہر دِکھانے شروع کر دیے۔ برسوں کویت میں گذارنے کے بعد وہ پھر پونہ آکر بس گئے اور پونہ ہی میں فالج کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔

کویت سے ۲۸؍ اگست ۱۹۷۹ء کے خط کے ساتھ حیاتؔ صاحب نے مجھے اپنی دو غزلیں ارسال کی تھیں۔ میں اپنی فائل کے حوالے سے دونوں غزلیں پیش کرتا ہوں۔

محفل میں جب چلی ہے تیرے بانکپن کی بات — اہل جنوں کے لب پہ ہے دار و رسن کی بات
انجامِ عشق دیکھ کے معلوم یہ ہوا — یہ تذکرہ بھی گویا ہے دیوانے پن کی بات
دنیا کے رنج و غم سے جنھیں واسطہ نہیں — سمجھیں گے کیا کسی کے وہ رنج و محن کی بات
نظریں ہیں جن کی دولتِ دنیا پہ روز و شب — سمجھیں گے کیا حیاتؔ وہ جیون مرن کی بات

....

آدمی کے دل میں جب تک حوصلہ ہوتا نہیں — زندگی میں پورا اس کا مدعا ہوتا نہیں
خود ہی اپنی فکر میں مَرتے ہیں روز و شب جو لوگ — اُن سے دنیا میں کسی کا بھی بھلا ہوتا نہیں
آدمی جب تک نہ کھائے چوٹ راہِ عشق میں — تب تلک وہ دردِ دل سے آشنا ہوتا نہیں
آدمی پیاسا رہے گا آدمی کے خون کا — جب تلک دل آدمی کا آئینہ ہوتا نہیں
جان بھی دیدے اگر کوئی کسی کے واسطے — پھر بھی قرضِ دوستی ہرگز ادا ہوتا نہیں
داغ جو لگ جاتا ہے اک بار دامن پر کبھی — مَرتے دم تک آدمی سے وہ جدا ہوتا نہیں

کس خطا کی یہ سزا ہم کو ملی ہے اے حیاتؔ
"ان کی محفل میں بھی ان کا سامنا ہوتا نہیں"

قمر الدین خان جوڈ

قمر الدین خان جوڈ کے کوائف معلوم نہ ہوسکے۔ ایک اندازے کے مطابق آزادی سے قبل ہی ان کا انتقال ہوچکا تھا، کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن طبیعت موزوں پائی تھی۔ کہبت اور دوہے کہنے میں ماہر تھے۔ سب سے پہلے عادلؔ فتح پوری نے محلّہ کے بزرگوں سے مل کر ان کی تین کہبت حاصل کر کے اپنی کتاب "نذیرؔ فتح پوری: ایک دوست ایک شاعر" میں شامل کی تھیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

قرض کمر دے توڑ چاہے جتنا ہو بلوان　　ہرن چوکڑی بھول جائے دیکھ کے تیر کمان

قمرؔ خطبے میں کھڑا قاضی سناوے بات　　چور سنگ چوری کرے فوجیاں کے سات

پانی کا کے پاک جی میں کچھ مچھ بیاوہے　　گائیاں کا کے پاک بو تو پھوڑو کھاو ہے

جناب ستار مولے خان پڑھیار کی فائل سے ایک چیز اور حاضر ہے۔

قمرؔ عدو کی دوستی، نا کریو وشواس　　ندی ورکھش پاواں پڑے، انت کرے وناش

ماسٹر اصغر علی خان پڑھیار

مرحوم اصغر علی خان سے میری متعدد ملاقاتیں تھیں۔ غالبؔ کے شیدائی تھے۔ سنجیدہ طبیعت پائی تھی۔ بستی اور محلّہ میں اپنی علمی قابلیت کا کبھی اظہار نہیں کرتے۔ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی۔ شعر بھی کہتے تھے۔ میں نے ان کی زبانی کبھی شعر نہیں سنا۔ نہ کبھی انھوں نے اس کا اظہار کیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند سلیم سے متعدد مرتبہ رابطہ قائم کیا لیکن ان کے اشعار سے متعلق کوئی علم نہیں ہوسکا۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۸۷ء کو انھوں نے ایک خط مجھے لکھا۔ جو من و عن یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ خط پونہ کے پتے پر لکھا گیا تھا۔

عزیز من جناب نذیر خان صاحب!

خدمت میں سلام عرض!

خط دیکھ کر تعجب ہوا ہوگا۔ برسوں بعد خط تحریر کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ویسے آپ کی یاد کو سینے سے لگا رکھا ہے۔ آپ کا شاہکار 'لمحوں کا سفر' میرے سرہانے رکھی رہتی ہے۔ گویا آپ موجود رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے آپ کو بھلا سکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خط لکھنے کے معاملے میں چور ہوں اور موڈ کا

غلام۔ موڈ نہ ہو تو دو سطر تحریر کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

افسوس خود اپنے آدمیوں نے آپ جیسی شخصیت کی کوئی قدر نہیں کی۔ کرتے بھی کیوں کر۔ قدر شناسی کا مادّہ ان لوگوں میں ہوا کرتا ہے جو باادب (میری مراد ادب شناسوں سے ہے) ہوں۔ اہل ادب ہونا تو بہت دور کی بات ہے، جہاں تک ادب کو تھوڑا بہت سمجھنے کا جو لوگ (کچھ لوگ) شعور رکھتے ہیں ان کی حالت مجھ جیسی ہے یعنی عملی طور پر ادب کی کچھ خدمت کر سکنے لائق اپنے میں ہمت نہیں پاتے۔ "حالِ بد گفتنی نہیں اپنا" جہاں تک نئی پیڑھی کا سوال ہے، بس کچھ نہ پوچھیے۔ کہنے کو ڈگری ہولڈر ہیں لیکن اردو ادب سے قطعی بے تعلق۔ ان کی اردو نالیج صفر کے برابر سمجھیے۔ اب فرمایئے آپ جیسی شخصیت کی قدر ہو تو کیوں کر ہو۔ البتہ ہمیں اس بات کا فخر ضرور ہے کہ ہماری برادری میں بھی کوئی اہلِ قلم ہستی موجود ہے۔ شیخاواٹی کی زمین بنجر ہے تو ادب کے معاملے میں بھی اس سے مختلف نہیں۔

شاید آپ کے ذہن میں سوال پیدا ہو کہ آخر بعد مدت دراز کے خط لکھنے کی کیا نوبت آگئی۔ نوبت نہیں ایک بہانہ مل گیا کہیئے۔

میں چچا غالب کا پرستار ہوں۔ بہت دنوں سے میری خواہش چلی آرہی ہے کہ دیوانِ غالب کی شرح اپنے پاس رکھوں۔ جے پور میں مسکین بک ڈپو اردو کی کتابوں کا واحد مرکز ہے۔ مہینوں سے وہاں تلاش ہے۔ کوئی اچھی معیاری شرح وہاں دستیاب نہیں ہو سکی ہے۔

آپ کے معاون جناب کالی داس گپتا رضا نے جو دیوانِ غالب ترتیب دیا ہے، جاننا چاہوں گا آیا وہ صرف انتخاب ہے یا شرح مکمل؟ اگر شرح ہے تو معیار کیسا ہے کیونکہ میں رضا صاحب سے واقف نہیں ہوں۔ اس لیے آپ اتنی زحمت کیجیے گا اور مجھے اپنی قابل رائے سے مطلع کیجیے گا۔ نیز کتاب کی قیمت ضرور لکھیے گا تاکہ میں پیشگی بھیج سکوں۔ خیال رہے کہ مجھے صرف مکمل شرح درکار ہے، انتخاب نہیں۔ بائی جمیلہ کو ہم دونوں کی طرف سے دعا۔ بچوں کو خوب سارا پیار۔ دیگر عزیزاں کو حسب مرتبہ آداب و سلام عرض کریں۔ ہم سب بخیر و عافیت ہیں اور امید ہے آپ بھی اسی طرح ہوں گے۔ یہاں ابھی بارش نہیں ہوئی ہے۔ شدید انتظار ہے۔ خدا حافظ۔ بصد خلوص و محبت

آپ کا اصغر

مرحوم اصغر علی خان پڑھیار رشتے میں میری اہلیہ کے تایازاد بھائی تھے۔ پہلے ماسٹری کی، اس کے بعد قوم کی خدمت کے طور پر عیدگاہ اسکول کی پانی کی ٹنکی کا انتظام دیکھنے لگے۔ شخصی اعتبار سے کافی نحیف و نزار تھے۔ کرتا پائجامہ زیب تن کرتے تھے۔ محلہ کی گلیوں میں کم کم دِکھائی دیتے۔

مرحوم حاجی یٰسین

آپ کا تعلق بیوپاری برادری سے تھا۔ شاعری کے معاملے میں بے حد جذباتی اور مخلص تھے۔ مناسب رہنمائی نہ ملنے کے سبب فنِ شعر سے واقفیت نہ ہو سکی۔ تاہم زندگی بھر شعر کہنے کی کوشش میں رہے۔ جذبات و تصورات کو سادگی کے ساتھ شعر کا روپ دینے کی جدوجہد نے یٰسین جی سے ایسے شعر کہلوائے ؎

رات بھر آپ کی یاد آتی رہی
دل دُکھاتی رہی ظلم ڈھاتی رہی

فصلِ گل بھی گئی تم نہ آئے مگر
سیج پھولوں کی مجھ کو رُلاتی رہی

آس میں آپ کی، راہ میں آپ کی
شام ہی سے دیے میں جلاتی رہی

رات کی بات کیا میں بتاؤں سکھی
اپنے یٰسین کو میں مناتی رہی

برسوں پہلے فتح پور میں یاسین صاحب سے ایک بار میری ملاقات ہوئی تھی۔ چند لمحوں تک وہ ساتھ رہے لیکن شعر و ادب کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس وقت ایسا کوئی ماحول بھی نہیں تھا۔ دوبارہ وہ مجھے کبھی نہیں ملے۔ نثار احمد راہی نے بتایا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

موجودہ شعراء

صفحہ نمبر

عارفؔ (پیر محمد عارف فتح پوری)

نام محمد عارف حسین اور تخلص عارفؔ۔ آپ کی پیدائش ۱۲؍ ذی الحجہ، یوم دو شنبہ ۱۳۵۳ھ بمقام فتح پور شیخاواٹی میں ہوئی۔ آپ نسبتاً فاروقی ہیں اور ہندوستان کے مشہور و معروف فقیہ حضرت سلطان التارکین صوفی حمید الدین ناگوری کی اولاد سے ہیں۔ آپ کا خاندان شیخاواٹی میں علم و فضل میں مشہور رہا ہے۔ آپ مرحوم حضرت مولانا غلام سرور صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ آپ کے والد صاحب کا ذکر پہلے آچکا ہے جو فارسی، اردو اور ہندی کے پُر گو شاعر تھے۔ عارفؔ صاحب نے اپنے والد محترم کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے خلافت حاصل کی۔ شاعری بھی آپ کو ورثہ میں ملی ہے۔ جب آپ کی عمر ۱۸؍ سال تھی تب آپ نے شعر و سخن کی ابتداء کی اور اپنے والد صاحب ہی سے اصلاح بھی لی۔

عارفؔ نے شاعری کو شہرت کا ذریعہ نہیں بنایا۔ صرف تسکینِ دل کے لیے کاروبار قرطاس و قلم کرتے رہے۔ ۱۹۶۴ء کے آس پاس کبھی کبھی مشاعرے میں شرکت کر لیا کرتے تھے لیکن آج مکمل گوشہ نشینی اختیار کر چکے ہیں۔ بلکہ 'جو آگیا فقیر کے در پر سو آگیا۔

آپ کا جتنا کلام موجود ہے وہ غزل ہی کے پیرایہ میں ہے۔ آپ کی غزلوں میں رنگِ تصوف، رنگِ تغزل کی اوٹ سے جھانکتا دکھائی دیتا ہے۔ آپ فلسفۂ وحدت الوجود کے قائل ہیں ؎

بند آنکھیں، سرنگوں، یکسوئی کامل کے ساتھ
حسنِ محبوبی کی اپنے دل میں ارزانی کو دیکھ

چھوڑ دے یک لخت سارے قصۂ دیر و حرم
سب سے بالاتر فضا میں حرزِ ایمانی کو دیکھ

آج تک دیکھے ہیں تو نے سیلِ طوفانِ مجاز
بحرِ مواجِ حقیقت کی بھی طغیانی کو دیکھ

عالمِ اصغر ہے تو ہر چیز ہے تجھ میں نہاں
اپنے اندر ہی متاعِ نورِ عرفانی کو دیکھ

ذاتِ اقدس صانعِ عالم کی خود ہے جلوہ گر
غور سے عارفؔ کبھی آدم کی پیشانی کو دیکھ

ذیل میں عارف صاحب کی دو غزلیں پیش کی جاتی ہیں۔ ان کے مطالعے سے آپ کے طرزِ سخن کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

کرنے عبورِ بحرِ فنا جارہا ہوں میں
گویا حباب ہوں کہ بہا جارہا ہوں میں

منزل کا ہے نشاں نہ پتا ہے مقام کا
دیوانہ ہوں کہ دُھن میں چلا جارہا ہوں میں

ان کی کشش ہے یا کہ محبت کا ہے اثر
بیٹھے بٹھائے خود ہی کھنچا جارہا ہوں میں

پڑتا ہے حسنِ شمع پہ پروانہ جس طرح
قربان اس طرح سے ہوا جارہا ہوں میں

محوِ رخِ تصورِ جاناں ہوں اس قدر
تصویرِ حسنِ یار بنا جارہا ہوں میں

عارفؔ ہوائے شوق کی نیرنگیاں نہ پوچھ
اک پھول ہوں کہ آپ کھِلا جارہا ہوں میں

غزل

مسیحا بن کے گر آتے وہ نیم جاں کے لیے
بھڑک کے شعلہ نہ اُٹھتا کبھی فغاں کے لیے

گرائی تھیں جو تبسم کی بجلیاں تم نے
بہانہ بن گئیں اک مرگِ ناگہاں کے لیے

ہزار بار ستم باغباں نے مجھ پہ کیے
مگر نہ ہوسکی پابندیاں زباں کے لیے

بیان کیسے کروں داستانِ غم اپنی
زبان دل کے لیے ہے نہ دل زباں کے لیے

مجھے جو غم ملا اس بے وفا کا اے عارفؔ
سہارا بن گیا اک عمرِ جاوداں کے لیے

صبؔا (عمر دین خان موئل)

نام عمر دین خان، والد کا نام فرید خان، تخلص صبؔا۔ ۴؍ مئی ۱۹۴۱ء کو آپ چوُرو کی ایک موئل برادری میں پیدا ہوئے۔ مولانا عبد الرحمٰن شاکر دہلوی سے مشورۂ سخن کیا۔ آپ نے حصولِ تعلیم کے لیے ایک لمبا سفر طے کیا۔ آپ نے ۱۹۶۲ء میں ہائر سیکنڈری اجمیر سے، ۱۹۶۵ء میں ادیب کامل جامعہ علیگڑھ سے، ۱۹۶۶ء میں بی اے جے پور سے، ۱۹۷۲ء میں راجستھان راجپوتانہ یونانی میڈیکل کالج جے پور سے عمدۃ الحکماء کے امتحانات پاس کیے۔ حکمت ہی کو آپ نے ذریعۂ معاش بھی بنایا اور ۱۹۷۲ء سے ۱۹۹۹ء تک راجستھان سرکار کے یونانی مراکز میں اپنی خدمت انجام دے کر وظیفہ یاب ہوئے۔ ابھی تک آپ کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ شاعری کے علاوہ آپ نے علم طب پر کافی اہم مضامین لکھے ہیں۔ معالجات کے تعلق سے آپ کی درسی کتب چار جلدوں میں مکمل ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ مفرداتِ ادویہ پر بھی دو جلدیں مکمل کر چکے ہیں۔ جو جلد ہی منظر عام پر آنے والی ہیں۔

صبؔا صاحب فتح پور میں 'حکیم صاحب' کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ فتح پور میں مستقل سکونت

اختیار کر چکے ہیں۔

حکیم عمر دین خان صبا کا رنگِ سخن سادہ اور سرل ہے۔ آپ کی حکمت نے آپ کی شاعری کو کھل کھیلنے کے مواقع خال خال ہی دیے ہیں، اس لیے آپ نے شاعری کو اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا لیکن ان کے اندر سانس لیتے ہوئے شاعر نے انھیں ردیف و قافیہ کے حصار سے آزاد بھی نہیں ہونے دیا۔ آپ نے نعت، غزل اور نظم کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

حاصل انتظار آیا ہے ساتھ اپنے بہار لایا ہے

کیا چمن میں بہار ہے رقصاں وحشتوں پر نکھار آیا ہے

ذوقِ بادہ بھی، پاسِ توبہ بھی ابر کیا انتشار لایا ہے

خوب جب آزما چکے مجھ کو تب کہیں اعتبار آیا ہے

عکسِ خورشید کی قسم اے صبا

کیا رُخِ تابدار آیا ہے

وہ ہے معراجِ جنوں، یہ ہے کمالِ وحشت حسن پہ مٹنا، رہِ عشق میں رسوا ہونا

وعدہ کرتے ہو کرو، یہ بھی مگر دھیان رہے وعدہ آسان ہے، دشوار ہے ایفا ہونا

....

وقت سے تیز تھا جب گام اپنا وقت کرتا تھا احترام اپنا

غم نوازوں کی شان تو دیکھو وہ نہیں لیتے انتقام اپنا

کیف سجدوں میں کیوں نہ حاصل ہو دھیان اس کا بنا امام اپنا

اس قرینے سے جی سکو تو جیو ہو فرشتوں میں احترام اپنا

منزلیں چوم لیں قدم تیرے

اے صبا وہ بنا مقام اپنا

کریمؔ (عبد الکریم خان)

نام عبد الکریم خان، والد عبد الرحیم خان۔ آپ ۱۲/ دسمبر ۱۹۴۰ء کو سیکر راجستھان میں پیدا ہوئے۔ حالات کی سفاکیوں اور ماحول کی ستم ظریفیوں نے آپ کو مکتبی تعلیم سے محروم رکھا۔ آپ نے اپنی خانگی زندگی کو بنانے اور راہ پر لانے کے لیے شدید جدوجہد کی ہے۔ حالانکہ آلام و مصائب سے

ہمیشہ آپ کا سابقہ رہا لیکن جواں مردی اور صبر و استقلال کے ساتھ آپ نے سب کا مقابلہ کیا۔ آپ کو مختلف شکلوں میں درد کے جو خزانے ملے آپ نے انھیں اپنے سینے میں محفوظ کر لیا اور پھر اس کی نکاسی اور اخراج کے لیے خدا نے آپ کو شعر گوئی کی قوت عطا کر دی۔ یہاں ایک نظم پیش کی جاتی ہے جس سے کریم صاحب کا احتجاجی لہجہ نمایاں ہوتا ہے۔

"میں کسی کا نہیں کوئی میرا نہیں"

میں وہ شب ہوں کہ جس کا سویرا نہیں

ہم سفر کی مجھے اب ضرورت نہیں   راستے میں ٹھہرنے کی عادت نہیں
میں تو خانہ بدوشوں کی مانند ہوں   مستقل اک جگہ میرا ڈیرا نہیں
میں کسی کا نہیں کوئی میرا نہیں

عمر بھر نفرتوں میں مَیں پلتا رہا   سب گراتے رہے میں سنبھلتا رہا
رہبروں کی نگاہوں میں رہزن ہوں میں   سچ تو یہ ہے میں کوئی لٹیرا نہیں
میں کسی کا نہیں کوئی میرا نہیں

رات بھر میں ستاروں سے باتیں کروں   کہکشاں دیکھ لوں، ٹھنڈی آہیں بھروں
چاند کی چاندنی سے ہے نفرت مجھے   اور اُجالوں میں میرا بسیرا نہیں
میں کسی کا نہیں کوئی میرا نہیں

میں نے مانگی دعائیں امن کے لیے   خون میں نے دیا ہے وطن کے لیے
پھر بھی کہتے ہیں مجھ سے یہ اہلِ وطن   اس وطن سے چلا جا یہ تیرا نہیں
میں کسی کا نہیں کوئی میرا نہیں

کریم صاحب عوامی شاعر ہیں۔ عوامی شاعری میں فن کی نمائندگی خال خال ہوتی ہے۔ جذبات کے راست اظہار کو یہاں اہمیت ہے۔ کریم صاحب نے خالص شیخاواٹی کی زبان میں بے پناہ گیت لکھے ہیں۔ جب وہ اپنے گیت خود گا کر پیش کرتے ہیں تو سماں بندھ جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری فن سے الگ ہو جاتی ہے بلکہ بلند ہو جاتی ہے۔

کریم صاحب نے دیش کی محبت میں کچھ ہندی گیت بھی لکھے ہیں جو صرف کریم صاحب ہی کے جذبات کا اظہار نہیں کرتے بلکہ اس قوم کے جذبات کا بھی اظہار کرتے ہیں جس قوم سے کریم صاحب کا تعلق ہے۔

نجمی (غلام جیلانی)

نام غلام جیلانی، قلمی نام نجمی فتح پوری۔ والد کا اسم گرامی حاجی غلام سرور صاحب فتح پوری۔ نجمی صاحب ۴/ اپریل ۱۹۴۲ء کو فتح پور شیخاواٹی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا گھرانہ حضرت خواجہ حاجی نجم الدین سلیمانی چشتی کے نام سے موسوم و منسوب ہے۔ اسی نسبت سے آپ نے اپنا تخلص نجمی رکھا ہے۔

نجمی صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت ان کے والد مرحوم حاجی غلام سرور صاحب کی نگرانی میں ہوئی۔ جب والد صاحب کا وصال ہوا تو آپ نے اسلامیہ اسکول عیدگاہ فتح پور شیخاواٹی میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد بقول خود، وقتاً فوقتاً جامعہ اُردو علیگڑھ سے ادیب، ادیب ماہر وغیرہ کے امتحانات میں کامیابی حاصل کر کے اسناد حاصل کیں۔ آپ اپنی شعر گوئی سے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"شعر گوئی کا ذوق و شوق فقیر کو اپنے والدی و مرشدی اور اپنے جدامجد حضرت خواجہ حاجی نجم الدین صاحبؒ کے عارفانہ کلام کے مطالعے سے پیدا ہوا۔ کیونکہ آپ کے عارفانہ کلام سے ہر اہلِ ذوق و شوق حضرات پر اسرارِ مخفی منکشف ہوتے ہیں۔ بس فقیر کو بفیضِ روحانی والدی و مرشدی، شعر گوئی کا سلیقہ پیدا ہو گیا اور شعر کہنے شروع کر دیے"۔

یہاں نجمی صاحب نے انکسار کا اظہار کرتے ہوئے خود کو فقیر لکھا ہے۔ صوفیہ کرام کی اصطلاح میں فقیر کے معنی اس طرح ہوتے ہیں: (۱) 'ف' سے فاقہ۔ (۲) 'ق' سے قناعت۔ (۳) 'ر' سے ریاضت۔ نجمی صاحب خوش گلو شاعر ہیں۔ ترنم سے ایسا جادو جگاتے ہیں کہ سننے والے کلام کی افادیت کا اندازہ ہی نہیں لگا پاتے۔ نمونۂ کلام

تسکین روح کو ہے نہ دل کو قرار ہے — اے جانِ انتظار ترا انتظار ہے

سجدے مچل رہے ہیں جبیں بے قرار ہے — اے بیخودی بتا کہ یہ کس کا دیار ہے

یہ تو جمالِ یار کے جلووں کی ہے کشش — ورنہ جبینِ شوق کو کیا اختیار ہے

حسنِ نگاہِ یار کی تاثیر دیکھئے — جس پر نظر پڑی ہے وہی تابعدار ہے

اللہ رے بشر کو یہ اعزازِ سروری — خاکی ہے اور نائبِ پروردگار ہے

اے جانِ حسن! دید کی لذت لیے ہوئے
نجمی بھی تیرے لطف کا اُمیدوار ہے

غــزل

جب سے تجھے دیکھا ہے دل ہوگیا بیگانہ   صدقے میں ترے جاؤں اے جلوۂ جانانہ
زاہد کو مبارک ہو، تقدیسِ حرم خانہ   کافی ہے مجھے واعظ! سنگِ درِ جانانہ
ساقی تری محفل میں کیا طرفہ تماشا ہے   فرزانہ ہے دیوانہ، دیوانہ ہے فرزانہ
کیا اہلِ خرد جانیں، کیا اہلِ جنوں سمجھیں   مجذوبِ محبت کا انداز جداگانہ

نسبت مجھے اے نجمی اس در کی میسّر ہے
جس در کی گدائی کے انداز ہیں شاہانہ

سیم و زر دے نہ شانِ شاہانہ   مجھ کو انداز دے فقیرانہ
عاشقی کا شعور ہو کہ نہ ہو   یار جانے ہے میرا یارانہ
نجمی کہتے غزل تو ہیں لیکن   ان کے انداز ہیں جداگانہ

عادلؔ (محمد اسمٰعیل)

نام محمد اسماعیل، والد کا نام محمد یاسین، تاریخ پیدائش ماہ اگست ۱۹۴۴ء، مقام پیدائش فتح پور شیخاواٹی، درجہ پنجم تک اسلامیہ اسکول عیدگاہ میں تعلیم حاصل کی۔ بقیہ تعلیم نان میٹرک۔ تقریباً ۳۵ر سال سے شاعری کے میدان میں اپنے افکار کے موتی لٹا رہے ہیں۔ منصور چوروی صاحب سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔ نعت، غزل، نظم، گیت، دوہا، قطعہ، ماہیا جیسی اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ فتح پور کے بیشتر شعراء کی طرح ترنم سے پڑھتے ہیں۔ عادل کی زندگی کا عکس ان کی شاعری پر چھایا ہوا ہے۔

کیا میں نے بگاڑا ہے اے برقِ بلا تیرا   اک میرا نشیمن ہی کیوں تیرا نشانہ ہے

عادلؔ نے اپنے تخلص کی رعایت سے اپنی غزل کے مقطعوں کو معنویت عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔

تمام عدل کی باتوں کو چھوڑ کر عادلؔ   زمانہ کہتا ہے رنگیں غزل کا باب لکھو

شاعری کے علاوہ عادلؔ نے ادبی مضامین بھی لکھے ہیں۔ نثر میں آپ کی ایک کتاب 'نذیر فتح پوری: ایک دوست ایک شاعر' ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب 'تفہیمِ نذیر' کے سلسلے کی بنیادی کڑی ہے۔ اس کتاب پر ہندوستان اور پاکستان کے اہم ادبی رسائل اور اخبارات میں سیر حاصل تبصرے چھپ چکے ہیں۔ عادلؔ کی تخلیقات، نخلستان، اسباق، فکر و فن جیسے رسائل میں آچکی ہیں۔ کلام کے

نمونے حاضر ہیں۔

غزلیہ اشعار

مسموم ہَوا کیسی گلستاں میں چلی ہے
سبزے کا نشاں ہے نہ کوئی شاخ ہری ہے

پہلے تو بڑی مہر و محبت کی فضا تھی
کیا اب بھی ترے شہر کا ماحول وہی ہے

پھر شعر کے پیکر میں ڈھلے گی تیری خوشبو
پھر دل میں تری یاد نے انگڑائی سی لی ہے

کھاتا ہے جو محنت کی، ڈرتا ہے جو خالق سے
اس مردِ قلندر کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

جس مول بکے، دے کر، اس بوجھ کو ہلکا کر
آخر تجھے بنجارے ڈیرا تو اُٹھانا ہے

دوہے

آگے اتنا بڑھ گیا بدیوں میں انسان
دانت میں اُنگلی داب کر حیراں ہے شیطان

ہر گھر سے نفرت ملی ہر در سے دھتکار
جوگی منوا کیا ہوا ؟ اس بستی کا پیار

مَرے پڑوسی بھوک سے غیرت کر انسان
ایسی پونجی میں تری سار نہیں نادان

آہ کسی مظلوم کی، دکھیارے کا سراپ
عادلؔ ہیں دونوں بُرے، بچ کے رہنا آپ

قطعات

رہِ دشوار سے ہنس ہنس کے گزر جاتے ہیں
پار طوفانِ حوادث سے اُتر جاتے ہیں

تجھ کو اس بات کا احساس نہیں ہے ہمدم
تیرے دیوانے، ترے نام پہ مر جاتے ہیں

☆

لگے ہوئے ہو گھروندا مرا جلانے میں
سکوں نہ پاؤ گے تم اپنے آشیانے میں

چمن کو پھونکنا لمحوں کا کھیل ہے لیکن
تمام عمر لگی ہے اسے بنانے میں

☆

ماہیے

خالق ہے وہ جانوں کا
شان مرے رب کی
وہ رب ہے جہانوں کا

دشواریاں حل کرلے
نفس کے سودائی
کچھ نیک عمل کرلے

مکّار کی مکّاری
زر کی کرامت سے
بن جاتی ہے فنکاری

راہیؔ (نثار احمد)

نام نثار احمد، والد کا نام محمد حسین، تخلص راہیؔ۔ آپ ۱۹۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی جائے

پیدائش فتح پور ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم فتح پور کے اسلامیہ اسکول عیدگاہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد ادیب کامل کا امتحان بھی پاس کیا۔ آپ عرصۂ دراز سے کاروبار قرطاس و قلم سے منسلک ہیں۔ آپ کا سلسلۂ تلمذ بھی شاہد رتلامی مرحوم سے رہا ہے۔ آپ غزل کے علاوہ قطعات، نعت اور سلام کے میدان میں بھی اپنے ہنر کے جوہر دِکھاتے رہے ہیں۔ آپ کا شمار فتح پور کے مترنم شعراء میں ہوتا ہے۔ جو سنجیدگی، بردباری، ثابت قدمی ان کی زندگی میں پائی جاتی ہے اس کا پَرتو ان کی شاعری میں دِکھائی دیتا ہے۔ آپ کا اسلوبِ سخن بھی وہی ہے۔ جو فتح پور کے شعراء میں رائج ہے۔ جناب عنبر فتح پوری نے آپ کو نفسِ مطمئنہ کا شاعر قرار دیا ہے۔

راہیؔ صاحب کا حافظہ کمپیوٹر کی طرح ہے۔ جب سے آپ شعر و ادب کی دنیا میں آئے ہیں تب سے لے کر اب تک فتح پور میں جتنے مشاعرے، طرحی نشستیں اور اعزازی جلسے ہوئے ان تمام کا ریکارڈ راہیؔ صاحب کے ذہن میں محفوظ ہے۔ سابقہ شعراء کا بہترین کلام بھی راہیؔ صاحب کے حافظے میں موجود ہے جسے آپ موقع و محل کے لحاظ سے پیش کرنے کا ہنر بھی خوب جانتے ہیں۔ فتح پور کے سیاسی، سماجی اور ادبی حلقوں میں آپ کا یکساں احترام پایا جاتا ہے۔ زندگی کا طویل سفر طے کرنے کے بعد راہیؔ اپنے سفر کا خلاصہ ایک قطعے میں پیش کرتے ہیں ؎

قدم خوب ہم نے سنبھل کر اُٹھائے — فریبِ جہاں سے مگر بچ نہ پائے
ہوا ختم راہیؔ سفر زندگی کا — جہاں سے چلے تھے وہیں لوٹ آئے

غـزل

کیا پوچھتے ہو مجھ سے کیوں آنکھ یہ بھر آئی — اک لمحہ میں ٹوٹی ہے برسوں کی شناسائی
کی تم نے محبت کی کس وقت پذیرائی — اس وقت ہی تم آئے، جس وقت قضا آئی
کل میرے نہ ہونے کا احساس کسے ہوگا — روئے گی گلے مل کر تنہائی سے تنہائی
پھر درد نیا کوئی دے دیتے ہو اس دل کو — تم کیسے مسیحا ہو؟ یہ کیسی مسیحائی

کچھ دن کے لیے راہیؔ، ہنگامۂ عالم میں
میں بھی ہوں تماشائی، تم بھی ہو تماشائی

غـزل

گفتگو بے مثال کرتے ہیں — آپ تو بس کمال کرتے ہیں
جو سراپا جواب ہوں خود ہی — آپ اُن سے سوال کرتے ہیں

ہم بھی بیٹھے ہیں ان کی محفل میں دیکھیں، وہ کب خیال کرتے ہیں
تیری باتوں کے زخم ہیں دل میں ہم کہاں یہ ملال کرتے ہیں
تیری منزل کہاں ہے اے راہی
تجھ سے رستے سوال کرتے ہیں

غم کا صیاد ہنساتا رہا پھڑپھڑاتی رہی زندگی
کب ٹپک جائے کس کو خبر شاخ سے شبنمی زندگی
ڈھونڈتا ہے یہ راہی تجھے تو کہاں کھوگئی زندگی

نذیرؔ (نذیر احمد)

نام نذیر احمد، والد حاجی ابراہیم خان جوڈ۔ آپ کی پیدائش یکم دسمبر ۱۹۶۴ء میں فتح پور کے محلہ زمینداران کے جوڈ خاندان میں ہوئی۔ تعلیم درجۂ پنجم تک عیدگاہ اسکول میں حاصل کی۔ اس کے بعد تلاشِ معاش میں مہاراشٹر کے خوبصورت شہر پونہ چلے گئے۔ ۱۹۶۴ء میں آپ نے شعر و سخن کی طرف توجہ دی۔ ابتداء میں دلدارؔ ہاشمی نے رہنمائی کی، اس کے بعد عتیق احمد عتیق، کالی داس گپتا رضا جیسے اساتذہ سے اکتساب فن کیا۔ آپ نے ادب کے ہر میدان میں اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اپنی فطری تخلیق پسندی کے جوہر دِکھائے۔ آپ کی پہلی کتاب 'چٹانوں کے بیچ' جو ناول کی صورت میں تھی، ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ سب سے پہلے پونہ میں ناول لکھنے کا شرف نذیرؔ صاحب کو ہی حاصل ہے۔ اب تک آپ کی ۲۲ کتابیں چھپ کر اہلِ نقد و نظر سے داد وصول کر چکی ہیں۔ راجستھان اُردو اکیڈمی نے ۱۹۹۲ء میں آپ کو ایوارڈ سے نوازا تھا اور ۲۰۰۰ء میں آپ کی کتاب "جگن ناتھ آزاد: ایک مستقل ادارہ" پر انعام دیا تھا۔ مہاراشٹر اردو اکیڈمی کی جانب سے آپ کو پہلا انعام ۱۹۹۵ء میں مضامین کی کتاب 'لفظوں کے سائے تلے' پر اور دوسرا انعام ۲۰۰۰ء میں شاعری کی کتاب 'نیا دن پھوٹ کر نکلا' پر ملا۔ دیگر انعامات کی ایک طویل فہرست ہے جن کا ذکر یہاں مناسب نہیں۔ ۲۲؍ سال سے آپ ایک ادبی رسالہ 'اسباق' شائع کر رہے ہیں۔

نذیرؔ فتح پوری کے فکر و فن پر انڈوپاک کے اہلِ قلم نے کثرت سے لکھا ہے۔ نذیرؔ صاحب کی تخلیقات اردو کے تقریباً دو سو رسائل اور اخبارات میں چھپ چکی ہیں۔ آپ نے فل لینتھ ڈرامے اور فلمی اسکرپٹ بھی لکھتے ہیں۔ راجستھان کے اُردو نصاب کے درجۂ چہارم اور ششم کی کتابوں میں آپ

کی نظمیں شامل ہیں۔ ساہتیہ اکادمی نے بچوں کیلئے جو کتاب مرتب کی ہے اس میں آپ کی تخلیق شامل ہے۔ عادل فتح پوری نے ایک کتاب 'نذیر فتح پوری: ایک دوست ایک شاعر' لکھی ہے جسے 'بزمِ احساسِ ادب فتح پور' نے شائع کی ہے۔ ضیاء فتح پوری نے ایک تعارف نامہ مرتب کر کے شائع کیا۔ چند اشعار ۔

دنیا تو یہ نہ سوچ کہ کیا دیکھے جاؤں گا ۔ تیری طلب سے تجھ کو سوا دیکھے جاؤں گا

ڈھونڈا کرے گا مجھ کو مرے بعد ہر کوئی ۔ آئندہ نسل کو یہ سزا دیکھے جاؤں گا

....

طلسمِ دہر کے پردے ٹٹولتا کیسے ۔ میں آدمی تھا ترے راز کھولتا کیسے

تمام جسم تو بکھرا دیا تھا موسم نے ۔ میں اپنے آپ کو پھولوں میں تولتا کیسے

....

روشن تھی کل تو آئینۂ تمثال میں غزل ۔ اب گم ہے چہرا چہرا خد و خال میں غزل

یہ سادگیٔ فکر سخن ہی کی دین ہے ۔ ہم کو ملی ہے گاؤں کی چوپال میں غزل

باریکیاں غزل کی ذرا ہم سے پوچھئے ۔ ہر آئینے میں بال ہے اور بال میں غزل

....

مقفل حویلی کا در منتظر تھا ۔ وطن آکے دیکھا تو گھر منتظر تھا

اسے بھی خبر تھی ہمارے سفر کی ۔ سنا ہے کہ وہ بے خبر منتظر تھا

دوہے

تو اپنی چترائی کو سمجھا ہے انمول ۔ میری مٹھی لاکھ کی کھول سکے تو کھول

خشکی میں بھی پائے گا تو پانی تتکال ۔ سچ کی رسّی باندھ کر ڈول کنویں میں ڈال

کائرتا کے ہاتھ میں دے کر تیر کمان ۔ پچھتاوے کی آگ میں جلتا ہے سلطان

گوری بیٹھی سوچ میں رہ رہ آئے دھیان ۔ ساجن آئے تب ملے املی کا پکوان

ماہیے

بارود پہ بیٹھی ہے ۔ جب کوئی دعا مانگو ۔ گُل کا ہے نہ گِل کا ہے

میرے زمانے کی ۔ آسماں والے سے ۔ تم کو سنائیں کیا

یہ فاختہ کیسی ہے ۔ دھرتی کا بھلا مانگو ۔ یہ ماجرا دل کا ہے

نیّر (منصور احمد)

نام منصور احمد، والد کا نام عبد اللہ بکھید، تخلص نیّر۔ آپ کی پیدائش فتح پور شیخاوائی کے محلہ بیوپاریاں کے بکھید گھرانے میں اگست ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ نیّر صاحب نے بھی اپنی رہنمائی کے لیے شاہد رتلامی مرحوم ہی کا انتخاب کیا۔ آپ اپنا کلام ترنم سے پڑھتے ہیں۔ آپ کی علمی بصیرت عیاں ہے۔ علم دین سے بھی آپ کو شغف ہے۔ محلہ بیوپاریاں جمعیتِ قریش میں آپ اپنی خداداد صلاحیتوں سے کارہائے نمایاں انجام دیتے رہتے ہیں۔ مذہبی جلسوں اور ادبی محفلوں میں آپ بڑے ادبی انداز سے نظامت کرتے ہیں۔ نیر صاحب نے شاعری کو 'جی کا زیاں' نہیں بنایا۔ کثرتِ شعر گوئی آپ کے مزاج میں نہیں ہے۔ لیکن جو کچھ بھی کہا ہے سلیقے اور صفائی سے کہا ہے۔ نیر صاحب خلوص کے قائل ہیں۔ ایک شعر میں اس کا اظہار اس طرح کیا ہے ۔

جو زخم تم نے مجھ کو دیے تھے خلوص دل سے — میں نے رقم کیے ہیں وہ دل کی کتاب میں

نیّر صاحب نے اپنے دل کی کتاب میں بہت کچھ لکھ رکھا ہے۔ ممکن ہے کسی دن دل پر لکھا کاغذ پر لکھ کر کتاب کی صورت میں قارئین کے مطالعے کی میز پر پہنچادیں۔

نیّر صاحب کی غزلوں سے کچھ انتخاب پیش ہے۔

غزل

خوگرِ پاسِ ادب مجبور ہوکر رہ گئے — پاس رہ کر بھی ہم ان سے دور ہوکر رہ گئے

جو سبق ہم نے دیے تھے گردشِ ایام کو — وہ ہمارے ہی لیے دستور ہوکر رہ گئے

تم نے دیکھا اک نظر، میں نے ملائی اک نظر — یہ نشہ وہ تھا کہ دونوں چور ہوکر رہ گئے

اصل جو منصور تھے وہ دار کی زینت بنے — صرف ہم تو نام کے منصور ہوکر رہ گئے

اس سے پہلے غم زمانے کے رہے نیّر مگر
جب سے ان کا غم ملا سب دور ہوکر رہ گئے

غزل

کچھ بھی کمال و فن نہیں عزت مآب میں — مشہور کیسے ہوگئے حسنِ خطاب میں

تیرے کرم کا واسطہ دیتا ہوں اے خدا — رسوائیاں نہ ہوں مری یومِ حساب میں

جو زخم تم نے مجھ کو دیے تھے خلوص سے — میں نے رقم کیے ہیں وہ دل کی کتاب میں

اب تک نہ ہو سکا ہے مرے حق میں فیصلہ　　برسوں گزر گئے ہیں سوال و جواب میں

نیؔر یہی ہے دردِ محبت کی انتہا

مجھ کو سکون ملتا ہے اب اضطراب میں

غـــزل

بکھر گئے وہی منظر جنھیں سنورنا تھا　　سمٹ گئے وہی منظر جنھیں بکھرنا تھا

یہ کس مقام پہ کانٹے بچھا دیے تم نے　　اسی مقام سے تم کو بھی تو گزرنا تھا

عجیب حال تھا اس وقت دل کا اے نیؔر　　خطا بھی کرنی تھی انجام سے بھی ڈرنا تھا

....

ہر ظلم، ہر سزا مجھے منظور ہے مگر　　الزامِ بے وفائی خدارا نہ دے مجھے

میں جب بھی چاہوں اپنا مقدر سنوار لوں　　اے نامرادِ وقت دلاسہ نہ دے مجھے

قمؔر (محمد الیاس)

نام: محمد الیاس، والد کا نام محمد حنیف۔ آپ کی پیدائش ۲۶ر جون ۱۹۴۸ء کو فتح پور شیخاواٹی، محلہ بیوپاریان میں ہوئی۔ آپ نان میٹرک ہیں۔ عرصہ دراز سے شعر کہہ رہے ہیں۔ آپ کا شمار بھی مرحوم شاہد رتلامی کے تلامذہ میں ہوتا ہے۔ آپ ایک طویل عرصہ تک حصولِ معاش کے سلسلے میں کویت میں رہے۔ پچھلے آٹھ دس برسوں سے آپ نے فتح پور ہی میں اپنا کاروبار شروع کر رکھا ہے۔ یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ درگاہ حاجی نجم کے شعراء کو چھوڑ کر فتح پور کے کسی شاعر کو شاعری کا ورثہ نہیں ملا۔ قمؔر صاحب کو بھی شاعری وراثت میں نہیں ملی۔ آپ نے تخلیقِ شعر کے میدان میں جو کچھ پایا ہے، اپنی فطری صلاحیتوں اور شاہد رتلامی جیسے اُستاد کی رہنمائی سے پایا ہے۔ قمؔر صاحب آج بھی اُستاد کا نام بڑے احترام سے لیتے ہیں۔

قمؔر صاحب کی غزل میں زندگی کے حسین مرقعے جگہ جگہ تابندہ دِکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے آپ میں اندھیروں سے لڑنے کی ہمت رکھتے ہیں۔

لہٗو بھر دیا ہے چراغوں میں دل کا　　کہاں تک میں رکھتا اندھیرے میں گھر کو

قمؔر صاحب کی غزلوں پر تفصیل سے اظہارِ خیال کی ضرورت نہیں۔

قمؔر صاحب اپنے ہم عصر مترنم شعراء کی محفل میں اپنے مخصوص تحت سے غزل سنا کر داد حاصل کرتے ہیں۔ چند غزلیں پیش کی جاتی ہیں۔

تو ہے غزل کے مطلعِ اولیٰ کی اک مثال　　باقی ردیف، قافیہ، مضمون اور خیال

لاؤں کہاں سے ڈھونڈ کے تیری کوئی مثال　　اس جستجو میں بیت گئے کتنے ماہ و سال

دل حسنِ کائنات کی تصویر بن گیا　　لے آیا اس مقام پہ مجھ کو ترا خیال

ہر رات چاند رات ہے میرے لیے قمرؔ

جب سے ہوا ہے مجھ کو میسّر ترا وصال

غـــزل

جب سے محسوس کیے دل میں اُجالے میں نے　　اپنا دامن کیا کانٹوں کے حوالے میں نے

تیری تصویر زمانے کو دِکھانے کے لیے　　دل کے زخموں سے نچوڑے ہیں اُجالے میں نے

ناسمجھ پھر بھی نہ سمجھے مرے زخموں کی زباں　　لاکھ دنیا کو دیے تیرے حوالے میں نے

سنگ برسائے زمانے نے دوانہ کہہ کر　　جب دِکھائے تری دنیا کو اُجالے میں نے

مردہ تہذیب کے فرسودہ خیالات قمرؔ

اک سمندر کی طرح دور اُچھالے میں نے

غـــزل

چنا جس کس نے تری رہ گزر کو　　ملی کامیابی اسی راہ بر کو

جو پتھر میں بھر دے صفت آئینے کی　　وہ خوبی عطا کر تو میری نظر کو

ملی حوصلوں کو سند پختگی کی　　کیا پیش جب جب صلیبوں پہ سر کو

ابھی داغ دامن سے دُھلنے ہیں باقی　　برسنے دو کھل کر ابھی چشمِ تر کو

قمرؔ ہوش رہتا ہے کب بندگی کا

جائے نہ جب تک محبت جگر کو

فرازؔ (شبیر حسن)

نام شبیر حسن، والد کا نام محمد یٰسین، تخلص فرازؔ۔ آپ ۱۹۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ فتح پور شیخاواٹی آپ کی جائے پیدائش ہے۔ چورو شیخاواٹی کے اُستاد شاعر جناب احمد علی خان منصور کے ہونہار شاگردوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق آپ ۱۹۸۴ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ نعت، غزل، قطعہ اور ماہیا کے علاوہ آپ نے داغؔ اور فیضؔ کی غزلوں پر خوبصورت تضمین بھی کہی ہے۔ آپ کا کلام

کثرت سے اُردو کے اہم رسائل میں شائع ہوتا ہے۔ چند رسائل کے نام اس طرح ہے: ایوانِ اردو، نخلستان، فکر و فن، پیش رفت، اسباق اور جرمنی سے شائع ہونے والا ماہنامہ اُردو دنیا۔ آپ کا ترنم نرالا اور سحر انگیز ہے۔ راجستھان کے تمام اضلاع میں آپ اپنا کلام سنا چکے ہیں۔ ممبئی، پونہ اور لوناولہ کے مشاعروں میں بھی آپ اپنے کلام اور ترنم کا جادو جگا چکے ہیں۔ آپ کی شاعری کی عمارت بھی روایتوں ہی کی بنیاد پر تعمیر ہوئی ہے۔ رومانیت، سنجیدگی کے ساتھ آپ کے مزاج میں رچی بسی ہوئی ہے۔ اسی کے سائے میں آپ نے زندگی اور شاعری دونوں کے سفر طے کیے ہیں۔ مطالعہ کا بے حد شوق ہے۔ اسلامی تاریخ کا مطالعہ اور علامہ اقبالؔ کی شاعری سے آپ کو خصوصی شغف ہے۔ جو پڑھتے ہیں حافظے میں محفوظ رکھتے ہیں۔ آپ نے آئینہ اس لیے محفوظ رکھا ہے کہ زندگی کا سنورنا ابھی باقی ہے۔

آئینہ اس لیے محفوظ رکھا ہے ہم نے زندگی تیرا سنورنا تو ابھی باقی ہے

آپ کا شعری مجموعہ "تمنا کا پہلا قدم" ۲۰۰۳ء میں شائع ہو چکا ہے، جس میں منصور چوزوی، شین کاف نظام، عادلؔ فتح پوری، ضیاءؔ فتح پوری اور راقم الحروف کی آراء شامل ہیں۔ انتخابِ شعر۔

غزل

اعتماد اتنا بکھرنا تو ابھی باقی ہے اپنے ہی سائے سے ڈرنا تو ابھی باقی ہے

دیکھ کر آبلے کیوں بیٹھ گئے ہو صاحب! عشق میں جاں سے گزرنا تو ابھی باقی ہے

شام کے وقت مجھے ڈوبتے دیکھا لیکن ڈوب کر میرا اُبھرنا تو ابھی باقی ہے

آئینہ اس لیے محفوظ رکھا ہے ہم نے زندگی تیرا سنورنا تو ابھی باقی ہے

اس اسی بات پہ کاٹیں گے شبِ ہجر فرازؔ
اس کا وعدے سے مکرنا تو ابھی باقی ہے

غزل

ملی آخرش رہ گزر چلتے چلتے ہوئی زندگی معتبر چلتے چلتے

یہ دیوار و در کیوں مہکنے لگے ہیں یہ کون آگیا میرے گھر چلتے چلتے

حدیں آگئی ہیں زمیں آسماں کی کہیں تو ٹھہر ہم سفر چلتے چلتے

ترے ساتھ ہی جائے گا دردِ دل بھی مجھے کہہ گیا چارہ گر چلتے چلتے

فرازؔ ان کے نقشِ قدم پر چلو تم
ملے گا تمھیں ان کا در چلتے چلتے

قطعات

وقت جب بھی مزاج بدلے گا تخت بدلے گا تاج بدلے گا
آپ رسم و رواج تو بدلیں پھر یقیناً سماج بدلے گا

....

ترے غرور کا پانی یونہی اُترنا تھا اُبھر گیا وہ جسے ڈوب کر اُبھرنا تھا
ہزار کشتی کو طوفاں کا سامنا تھا مگر وہ پار اُتر ہی گیا جس کو پار اُترنا تھا

ماہیے

آنکھوں میں جو پانی ہے
مول نہیں اس کا
یہ جھیل پرانی ہے

پھر اُترا ہے چوری سے
چاند سمندر میں
ملنے کو چکوری سے

پھولوں پہ شباب آیا
جب بھی بہار آئی
بلبل پہ عذاب آیا

عنبؔر (محمد صلاح الدین)

نام محمد صلاح الدین، قلمی نام عنبر، والد کا نام یوسف کھوکھر۔ ۱۹۵۲ء میں آپ کی پیدائش فتح پور شیخاواٹی کے محلہ بیوپاریان میں ہوئی۔ رتلام ایم پی کے مشہور اُستاد مرحوم شاہد رتلامی سے مشورۂ سخن کیا۔ غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں، تاہم غزل کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ خدانے آپ کو ترنم کی دولت سے بھی نوازا ہے۔ مشاعرے میں کلام پیش کرنے کا عنبؔر صاحب کا اپنا انداز ہے۔ شاعری کے علاوہ آپ تنقیدی مضامین، عروضی تجزیے اور ادبی تبصرے بھی لکھتے ہیں۔ آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ کویت میں گزرا ہے، اس لیے آپ کا حلقۂ احباب وسیع ہے۔ عنبؔر صاحب شاعری کے نکات اور زندگی کے نشیب و فراز کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ اسی لیے دونوں میدانوں میں سرخ رو نظر آتے ہیں۔ فنکار اگر کور چشم ہو تو اس کا فن بھی کور چشمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ عنبؔر صاحب کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ان کے ذہن کی وسعت ان کے کلام میں صاف نظر آتی ہے۔

عنبر صاحب کو لفظوں سے کھیلنے کا ہنر بھی آتا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ کریں ؎

تیرے آنے کی خوشی سے تیرا غم بہتر صنم اس خوشی پر ناز کیسا جو خوشی آئی، گئی

آپ کا شعری مجموعہ 'برف کی فصلیں' عنوان سے جنوری ۱۹۹۹ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ جسے محمد شفیق ربان نے منتخب کرکے ترتیب دیا تھا۔ اس مجموعے کی ابتداء میں ڈاکٹر عصمت جاوید، باقی احمد پوری، مسرت جبیں زیبا، غلام مصطفےٰ بیکس اور منیر فراز کی آراء شامل ہیں۔ بیکس صاحب نے عنبؔر کو

منصبِ شاعری اور رموزِ شاعری سے آشنا شاعر کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر عصمت جاوید نے عنبر کو اس کی داد دی ہے۔

بنا عمل کوئی تکمیل غیر ممکن ہے
کہ اب ہجومِ ابابیل غیر ممکن ہے

'برف کی فصلیں' سے منتخب اشعار

جس شہر میں اُگتی ہیں سدا برف کی فصلیں
وہ شہر بھی اب برق و شرر مانگ رہا ہے

تقریرِ وہاں کون کرے امن و اماں کی
ہر شخص جہاں تیغ و تبر مانگ رہا ہے

جب دامنِ ہستی کو پھیلا ہی لیا جائے
پھر خواہشِ قطرہ کیوں، دریا ہی لیا جائے

تقسیم اگر ہوگی جب گلشن و صحرا کی
دل کا یہ تقاضا ہے صحرا ہی لیا جائے

کوئی سولی پہ چڑھتا ہے کوئی گھٹ گھٹ کے مَرتا ہے
نتیجہ زندگانی کا عدم، یوں بھی ہے اور یوں بھی

مل جائے گی منزل تجھے یہ کام تو کر جا
پھولوں کی تمنا ہے تو کانٹوں سے گزر جا

ہنس لے تو مرے حال پہ اے گردشِ دوراں
بدلیں گے یقیناً مرے حالات ٹھہر جا

ہوئی ہے جب سے شناسائی حادثوں سے مری
میں ان کی اور وہ میری نظر میں رہتے ہیں

سہارا دے نہیں سکتے کسی کو وہ عنبر
قدم قدم پہ جو خود لڑکھڑاتے رہتے ہیں

اگرچہ محوِ الم ہوں میں باوجود اس کے
امیرِ شہر کی تعمیل غیر ممکن ہے

یہ مسئلہ تو مکرر دِکھائی دیتا ہے
چھپاؤں پیر تو پھر سر دِکھائی دیتا ہے

جو مفلسی کی حدوں سے گزر گیا ہو اسے
ہر ایک شخص سکندر دِکھائی دیتا ہے

ہوئے نہ زخم مرے مندمل تو کیا ہوگا
یونہی رہے یہ اگر مستقل تو کیا ہوگا

جب بھی آہٹ کوئی سنتا ہوں تو لگتا ہے مجھے
میری منزل کی طرف ان کے قدم آتے ہیں

لاکھ کھوٹا کہے عنبر کو زمانہ لیکن
مشورہ جس کو بھی دیتا ہے کھرا دیتا ہے

گوہرؔ (شوکت علی تنور)

نام شوکت علی، والد غلام عیسیٰ تنور۔ ۳؍ ستمبر ۱۹۴۸ء فتح پور شیخاواٹی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں آپ نے شاہد رتلامی مرحوم کی رہنمائی میں شاعری کے سفر کا آغاز کیا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ کم گوئی کے ساتھ ہی کم سخنی بھی آپ کی عادت میں شامل ہے۔ آپ بھیڑ کا حصہ بننا پسند نہیں کرتے اس لیے الگ تھلگ اپنی ہی دُھن میں رہتے ہیں۔ ناصر کاظمی کا یہ مطلع گوہرؔ صاحب کی شخصیت کا

غماز ہے۔

اپنی ڈھن میں رہتا ہوں میں بھی تیرے جیسا ہوں

گوہرؔ صاحب مشاعرہ حاصل کرنے کے گُر سے چاہے واقف نہ ہوں لیکن مشاعرہ پڑھنے کے گر سے بخوبی واقف ہیں۔ تحت میں پڑھتے ہیں اور رنگ جماتے ہیں۔

گوہرؔ صاحب کی شاعری کا رنگ روایت سے ہم آہنگ ہے۔ رائج تمثیلات اور استعاروں کے توسط ہی سے گوہرؔ صاحب نے اپنی فکر میں تخلیقی رنگ بھرنے کی سعی کی ہے۔ آپ صرف غزل کہتے ہیں۔ غزلوں سے کچھ انتخاب ملاحظہ کریں ؎

غزل

یہی کہہ کے سمجھایا، دل کو، جگر کو   تعلق بڑا ہے دعا سے اثر کو

جسے سنگ کہہ کر تراشا گیا ہے   اسی نے زباں دی ہے دستِ ہنر کو

مری زندگی معتبر ہوگئی ہے   ترے در پہ جب سے جھکایا ہے سر کو

کئی حادثے یوں تو گزرے ہیں لیکن   بھلا نہ سکا میں تری چشمِ تر کو

بوقتِ سفر ہے دعا میری گوہرؔ

رب آسان کردے مری رہ گزر کو

غزل

غم کے ماروں کی زمانے میں وہ بستی ہوگی   جس جگہ غم کی گھٹا کھل کے برستی ہوگی

نقشِ پا جس کے چمکتے ہیں ستاروں کی طرح   کتنی دلکش مرے محبوب کی ہستی ہوگی

یہ حوادث تو ضروری ہیں گوہرؔ ترے لیے

ان سے ڈرنا تو ترے عزم کی پستی ہوگی

غزل

ان آنکھوں سے کسی کی بے بسی دیکھی نہیں جاتی   تڑپتی، تلملاتی زندگی دیکھی نہیں جاتی

مسیحا بن کے اعجازِ مسیحائی دِکھا جاؤ!   دمِ آخر اگر یہ جاں کنی دیکھی نہیں جاتی

میں آنکھیں بند کرلوں، موت آجائے تو اچھا ہے   تری پلکوں پہ آنسو کی لڑی دیکھی نہیں جاتی

میں جب بھی مسکرایا ہوگئی دنیا خفا گوہرؔ

جہاں والوں سے کیوں میری خوشی دیکھی نہیں جاتی

وقارؔ (لیاقت علی خان)

نام لیاقت علی خان، والد کا نام صوبہ دار رحیم خان، تخلص وقارؔ۔ وقارؔ صاحب کی پیدائش ۲۱ر جولائی ۱۹۵۶ء کو پنجاب کے خوبصورت شہر جالندھر میں ہوئی۔ آپ ہندی میڈیم سے میٹرک پاس ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں پہلی غزل کہی۔ پہلی غزل راقم الحروف نے مصرع دے کر کہلوائی تھی۔ "چھلکے چھلکے آنسو چھلکے"۔ اس کے بعد آپ نے جو غزلیں کہیں ان پر منصور چوروی صاحب سے اصلاح لی۔ لیکن آپ نے شاعری کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی ورنہ آج موسم ہی دوسرا ہوتا۔ آپ کی شعری اُٹھان اور فکری پرواز کا اندازہ آپ کی مندرجہ ذیل غزلوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ ان دنوں آپ اگرچہ مکمل طور پر کاروبار میں مصروف نظر آتے ہیں لیکن کبھی کبھار شعر وادب کی محفلوں سے بھی گزر ہوتا رہتا ہے۔ ممکن ہے آئندہ برسوں میں وقارؔ صاحب سنجیدگی سے شعر و سخن کی آبیاری میں لگ جائیں اور فتح پور کے ادبی حلقوں میں کچھ اور اچھے اشعار کی گونج سنائی دے۔

غــزل

بعد تیرے اس جہاں میں اور کیا رہ جائے گا
تیری یادیں اور تیرا تذکرہ رہ جائے گا

قتل و غارت، خونِ ناحق اور فریب مستقل
تا قیامت کیا یہی اک سلسلہ رہ جائے گا

وہ عیادت کو مری اس وقت آئیں گے کہ جب
زندگی اور موت میں کچھ فاصلہ رہ جائے گا

میرا دعویٰ ہے سرِ محفل اُٹھا دینا نقاب
جو بھی دیکھے گا تجھے وہ دیکھتا رہ جائے گا

یہ بھی کیا کم ہے کہ میرے بعد دنیا میں وقارؔ
"میں چلا جاؤں گا میرا سانحہ رہ جائے گا"

پنارا عبد الرب نشترؔ

نام عبد الرب، والد کا نام عبد الجبار پنارا، تخلص نشترؔ۔ ۱۹۶۲ء کو فتح پور کے محلہ بیوپاریان میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۸۰ء سے شاعری کے میدان میں اپنی فکر کے جوہر دِکھا رہے ہیں۔ راقم الحروف سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔ برسوں سے دوبئی میں مقیم ہیں لیکن گاؤں کی مٹی کا احساس ان کے ذہن و دل پر ہمیشہ چھایا رہتا ہے۔ جس کا اظہار وہ اپنی شاعری میں اکثر کرتے ہیں۔ طبیعت میں تنہائی پسندی ہے۔ اس لیے ادبی محفلوں اور جلسوں سے دور رہتے ہیں۔ راجستھان میں غزل گو شعراء ایک تعارف (مرتب عبد الحئی)

میں ان کی درج ذیل غزل شامل ہے۔ یہ کتاب راجستھان اُردو اکیڈمی نے شائع کی تھی۔

کب کس کا اعتبار ہے اب اپنے گاؤں میں
قاتل ہی پہریدار ہے اب اپنے گاؤں میں

تنہائیوں کی دھوپ سروں سے گزر گئی
چاندی کا تار تار ہے اب اپنے گاؤں میں

یہ کس نے دھول وقت کی آنکھوں میں جھونک دی
ہر کوئی اشکبار ہے اب اپنے گاؤں میں

اک خانماں خراب تھے ہم ہی نہیں رہے
ہر شخص باوقار ہے اب اپنے گاؤں میں

ہے قاتلوں کے ہاتھ میں بازار کا نظام
زخموں کا کاروبار ہے اب اپنے گاؤں میں

خط کے ہر اک لفظ سے نشتر یہی کھلا
شاید وہ بے قرار ہے اب اپنے گاؤں میں

پروانہ (پون کمار شرما)

نام پون کمار، والد کا نام بدری پرساد شرما، تخلص پروانہ۔ آپ کی پیدائش ۱۰ر جنوری ۱۹۵۸ء کو فتح پور میں ہوئی۔ تعلیم کے میدان میں آپ نے بی کام تک کامیابی حاصل کی۔ آپ اردو اور ہندی میں ملی جلی شاعری کرتے ہیں۔ گیت اور بھجنوں کی طرف طبیعت کا رجحان زیادہ ہے۔ دھارمک جلسوں اور میلوں میں اپنا کلام اپنی ہی آواز میں پیش کرتے ہیں۔ موسیقی کا بھی علم رکھتے ہیں۔ اپنے گیتوں اور بھجن کی دھنیں بھی خود ہی بناتے ہیں۔ پروانہ صاحب فنونِ لطیفہ کے دوسرے میدانوں میں بھی اپنے ہنر کے جوہر دِکھا چکے ہیں۔ ڈراموں میں اداکاری کرتے ہیں۔ آزادی کے دیوانے، سکندر پورس، رام لیلا اور دوسرے راجستھانی ڈراموں میں اداکاری کر چکے ہیں۔ آپ نے ہندی اور راجستھانی فلموں میں بھی کردار ادا کیے ہیں۔ موسیقی اور گائیکی کے وسیلے سے بھی آپ نے فلموں میں اپنے فن کے نمونے پیش کیے ہیں۔ چڑو آکاش وانی سے لوک گیت گا چکے ہیں۔ زی ٹی وی کی سیریل "وہ صبح کبھی تو آئے گی" کے لیے گیت گا چکے ہیں۔ آپ بانسری اور بینجو کے مقابلے میں یونیورسٹی سے پہلا انعام حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کو سیکر، جھونجھنوں اور چڑو سے سنگیت کے سلسلے میں کئی انعامات مل چکے ہیں۔

پروانہ صاحب شری بنواری جی اور شبیر فرازؔ کو اپنا رہنما تسلیم کرتے ہیں۔ آپ کا ایک دوہا پیش ہے۔

دوھا

رس پیا نہ رس دیا رس بس گیا شریر
رس رس ہی کی موج میں پھرتا پھرا فقیر

ضیاءؔ (غلام دستگیر جوڈ)

نام غلام دستگیر، والد کا نام حسین خان جوڈ، عمر تقریباً ۳۲ سال۔ پچھلے کچھ سال سے شعر و ادب کی دنیا میں وارد ہوئے ہیں۔ راقم الحروف سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔ فتح پور کے ادبی، سماجی اور سیاسی حلقوں میں اہم اور کثیر الذکر نام ہے۔ کچھ ادبی (تعارفی) مضامین بھی لکھنے کا شوق رکھتے ہیں۔ دل اُمنگوں سے لبالب ہے۔ ذہن میں خیالات کا میلہ سا لگا رہتا ہے لیکن دائمی بیماری میں مبتلا ہونے سے اکثر ذہن ماؤف ہو جاتا ہے۔ ادبی شوق کو پروان چڑھانے میں دِقت پیش آتی ہے تاہم ایک طرز فکر کے مالک ہیں۔ جینے کا اپنا ایک انداز رکھتے ہیں اور احباب میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ فتح پور کے آزاد سینئر سیکنڈری اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ سیاست اور سماجی خدمات کا شوق بھی ہے۔

۲۰۰۲ء میں اپنے پونہ قیام کے دَوران آپ نے ایک کتابچہ "نذیر فتح پوری - ایک تعارف" مرتب کر کے شائع کیا۔ ان دنوں آپ کثرت سے ماہیہ نگاری میں لگے ہیں۔ تقریباً تین سو ماہیے تخلیق کر چکے ہیں۔ بہت جلد اپنے ماہیوں کا مجموعہ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ایک غزل حاضر ہے۔

غــزل

لاکھ دشمن مرا زمانہ ہے
پیار کا گیت مجھ کو گانا ہے

کیوں نہ باتیں کروں محبت کی
نفرتوں کو یونہی مٹانا ہے

کوئی کشتی کا ناخدا نہ سہی
پھر بھی ساحل ضرور پانا ہے

ڈوب کر عشق میں ضیاءؔ ہم کو
دور اہلِ خرد سے جانا ہے

شمبھو پرساد پاریکھ

شمبھو جی باوڑی گیٹ پر ایک کامیاب تاجر کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے

اندر ایک خوبصورت کلا پریمی، روزِ اوّل ہی سے براجمان ہے۔ وہ پرانے سنگیت کے شیدائی ہیں۔ محمد رفیع کی آواز نے انھیں دیوانہ بنا رکھا ہے۔ رفیع کے پرانے گیت ان کے کللکشن میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ اُردو شعر و ادب سے بھی انھیں گہرا شغف ہے۔ شبیر فراز کی قربتوں سے کچھ نہ کچھ کہنے کی مشق کرتے رہتے ہیں۔ قوالی اور مشاعروں کے سامعین کی پہلی صف میں نظر آتے ہیں۔ آج کے زہر آلود ماحول

میں شمبھو پاریکھ کی ذات ہندو مسلم اتحاد کا ایک نمونہ ہے۔ وہ صرف خاندان ہی سے پاریکھ نہیں بلکہ حقیقی زندگی میں بھی پاریکھ ہی نظر آتے ہیں۔ پرکھنے اور جانچنے کی اسی عادت نے انھیں فن اور فنکاروں کی دنیا میں ایک عزت بخشی ہے۔ باوڑی گیٹ کے بھیڑ بھاڑ والے ماحول میں بھی وہ شعر و نغمہ کی حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ آج کے ماحول میں شاعر سے زیادہ شاعر نواز ہونا اہم بات ہے۔ اور یہ اہمیت شمبھو پرساد پاریکھ کی شخصیت کی پہچان ہے۔ اُن کے دو شعر ؎

تمہاری یاد تو دل میں سمائی رہتی ہے تصورات میں خوشبو سی چھائی رہتی ہے
تمہارے وعدے کا کیسے یقین کرلیں ہم تمہارے چہرے پہ تو بے وفائی رہتی ہے

محمد حسین مدنی

محمد حسین مدنی پچھلے چند برسوں سے شعر کہنے لگے ہیں۔ تاہم مشاعروں میں انھیں سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔ عنبرؔ فتح پوری نے ہندی اخبار 'اپنا شیخاواٹی' میں پہلی بار مدنی صاحب کا تعارف پیش کیا۔ مدنی صاحب غزل اور نعت میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ میں نے اکثر ان کو مشاعروں کے معاون کے روپ میں دیکھا ہے۔ دامے درمے قدمے ادب کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔ مذہبی ماحول کے آدمی ہیں۔ بقول عنبرؔ شخصیت کے اعتبار سے آپ غیر معروف نہیں ہیں۔ چند اشعار

یہ زندگی ہماری امانت سے کم نہیں محفوظ خود کو رکھنا عبادت سے کم نہیں
فرقت میں آپ کی جو نکلتے ہیں اشک وہ تشنہ لبوں کے واسطے شربت سے کم نہیں
فکرِ معاش کس لیے مدنؔی کرے بھلا جو مل رہا ہے وہ بھی ضرورت سے کم نہیں

(فتح پور کے وہ شعراء جن کے عدم تعاون کی وجہ سے ان کا مفصل ذکر شاملِ تذکرہ نہیں ہوسکا، تاہم ان کا ذکر ضروری ہے۔)

ناصرؔ فتح پوری

ناصر فتح پوری ۱۹۶۴ء کے آس پاس جناب عشرت دھولپوری کی قیادت میں شعر کہنے لگے تھے۔ اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے لیکن آج کل مشاعروں اور شعری نشستوں سے کشاں کشاں رہتے ہیں۔ شعر و ادب کا ذوق البتہ آج بھی موجود ہے۔ فارسی اور اردو کے منتخب اشعار ازبر ہیں۔ جن کا اظہار اکثر

کرتے ہیں۔ آج بھی عشرت دھولپوری کو اپنا اُستاد مانتے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں ۔

دار پہ چڑھ کے منصور نے یہ کہا عشق میں دیکھ بندہ خدا ہوگیا
ہے بزمِ خرد میں جنوں کارفرما ہوا چاک داماں رفو کرتے کرتے

آپ کی عمر تقریباً ۶۰ سال ہے۔ کچھ دنوں تک آپ نے فتح پور کے کسی اسکول میں اُستاد کے فرائض بھی انجام دیے ہیں۔ اس لیے ماسٹر ناصر کے نام سے معروف ہیں۔

رفیق راز فتح پوری

رفیق، چوہان برادری سے ہیں۔ برسوں پہلے کویت میں قیام کے دوران مرحوم شاہد رتلامی کی رہنمائی میں شعر و سخن کی ابتدا کی تھی۔ اب مستقل فتح پور میں مقیم ہیں اور سیاسیات اور سماجیات کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ شاعری سے رشتہ بھی برقرار ہے۔ تحت اللفظ میں پڑھتے ہیں۔ تقریباً ۵۸ر سال کے ہیں۔ چند اشعار سے رنگِ سخن کا اندازہ لگ سکتا ہے

پانی کو شاخ شاخ ترستی ہے آج کل غنچہ و گل سے آگ برستی ہے آج کل
آئینے وقت کے جھلملانے لگے آپ بے ساختہ یاد آنے لگے
دوستوں کی ذہانت کو کیا ہوگیا ظرف پھر راز کا آزمانے لگا

یعقوب ناز فتح پوری

آپ ایک مدت سے کویت میں مقیم ہیں۔ برسوں پہلے شاہد رتلامی کی صحبتوں سے تخلیقِ شعر کا ذوق پیدا ہوا۔ عمر تقریباً ۵۴ر سال ہے۔ مختصر اوزان میں رواں شعر کہتے ہیں۔ چند اشعار

مثلِ انجم چمک جاؤں گا میں ہوں پتھر اُٹھا لے مجھے
کل کا سورج تمھیں بتائے گا میرے چہرے پہ کیوں اُداسی ہے

محمد اسمٰعیل غازی فتح پوری

عمر تقریباً ۴۰ر سال ہے۔ تقریباً پندرہ سال سے تخلیقِ شعر میں سرگرداں ہیں۔ ایک مجموعہ 'قطرے کی وسعت' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ منصور چڑوی سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔ ترنم سے

مشاعرے میں کلام سناتے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں۔

ہاتھ میں کشکول تیرے اے سکندر دیکھ کر
پیاس میری مٹ گئی پیاسا سمندر دیکھ کر

مردِ غازی تو سدا سینہ سپر ہوتا ہے
اس کو مرنے کا کہاں خوف و خطر ہوتا ہے

سہمے ہوئے بیٹھے ہیں زمیں پر ہی کبوتر
آتا ہے فلک دوش نظر طائر شہباز

شوکت جذبی

شوکت جذبی کا تعلق فتح پور کی چوہان برادری سے ہے۔ آپ عرصۂ دراز سے دوبئی میں کاروبار کرتے ہیں۔ شعر و ادب کی دنیا سے وابستہ ہیں۔ فکر سخن خال خال ہی کرتے ہیں۔ عمر تقریباً ۵۳ سال ہے۔ نمونہ کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔

رفیق منظر

رفیق منظر پچھلے دس سال سے شاعری کرتے ہیں۔ غزل اور ماہیے کہتے ہیں۔ تحت میں پڑھتے ہیں۔ فکر میں تازگی ہے، تصویروں میں رنگ بھرتے ہیں۔ مستقبل کے خوابوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ عمر تقریباً ۳۰ سال ہے۔

نہیں کوئی رہبر، چلا ہوں سفر کو
تلاشے گا خود حوصلہ رہ گزر کو

یہ کیا کہہ رہے ہو اسے بھول جاؤں
دبا کر کوئی رکھ سکا ہے شرر کو؟

کوئی اور جانے نہ جانے بلا سے
غزل جانتی ہے غزل کے اثر کو

اِدریس راز چوڑوی

راز صاحب درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ غزل کہتے ہیں۔ کبھی کبھی نظم بھی کہہ لیتے ہیں۔ آپ نے کچھ ادبی مضامین بھی لکھے ہیں۔ مشاعروں اور جلسوں کی نظامت بھی کرتے ہیں۔ تحت اللفظ میں پڑھتے ہیں۔ منصور چوڑوی سے اصلاح لیتے ہیں۔ کلام دستیاب نہ ہو سکا۔

❂❂❂

فتح پور شیخاواٹی کے چند تعلیمی اِدارے

اسلامیہ اسکول عیدگاہ

(اسکول کی صد سالہ تقریب کے موقع پر راجیہ پال انشومن سنگھ جی اور راجستھان کے وزیرِ تعلیم بی ڈی کلاّ)

پہلا مسلم مدرسہ یا اسکول
اسلامیہ اسکول عید گاہ

عید گاہ اسکول کا قیام ۱۹۰۰ء میں عمل میں آیا۔ ابتداء میں مسجد کے صحن میں تعلیم دی جاتی رہی، اس کے بعد فتح پور کے بازار میں سیٹھ حاجی وزیر کی دوکانوں کے اوپر اسے منتقل کردیا گیا۔ وہاں عربی، اُردو، ہندی اور انگریزی کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ وہاں کھلی چھت پر گرمیوں کے موسم میں بچوں کو جب تکلیف ہونے لگی تو اسی کے قریب محمد الفو بیوپاری کی دوکانوں پر بنے ایک چوبارے میں اسے منتقل کردیا گیا لیکن جب بچوں کی تعداد بڑھنے لگی تو پھر بازار سے اس مدرسے کو محلہ میں واقع خانجی کی حویلی میں لے آئے۔ اس کے بعد اسی محلہ کے ایک ہمدرد مرحوم بہادر خان مختار خان لنگا نے عید گاہ مسجد کے سامنے پڑی ہوئی زمین پر دو پختہ کمرے اپنے خرچ سے بنا کر اسے ایک باقاعدہ اسکول کی صورت دیدی۔ یہ ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا۔ ہندوستان ابھی آزاد نہیں ہوا تھا۔ تعلیم کی فراہمی کے اعتبار سے ابھی تک لوگوں کے ذہن بیدار نہیں ہوئے تھے۔ تاہم ذہن دھیرے دھیرے تعلیم کی روشنی کی جانب بڑھ رہے تھے۔

ابتداء میں اسے مسلم اسکول عید گاہ کا نام دے کر درجہ چہارم تک تعلیم دی جانے لگی۔ اسکے بعد درجہ پنجم کے لیے بچوں کو سیکر جانا پڑتا لیکن ۱۹۴۳ء میں جے پور اسٹیٹ کے پرائم منسٹر سر مرزا محمد اسمٰعیل و سیکر کے راؤراجا شری مان کلیان سنگھ جی نے اسکول کا دَورہ کیا اور حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے پہلے بنے دو کمروں کے برابر ایک قطعہ اراضی 35 x 200 کا اسکول کے نام وقف کردیا۔ ۱۹۴۵ء میں ہنگامی چندہ کر کے تین کمروں کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا لیکن ابھی بنیاد ہی تعمیر ہوئی تھی کہ آزادی کی جنگ کا بگل بج گیا اور آگے کا کام رُک گیا۔ آزادی کے بعد پھر ذہن حصولِ تعلیم کی جانب منتقل ہو گئے۔ اور باقاعدہ ایک مینجمنٹ بنا کر اسلامیہ اسکول عید گاہ کے نام سے اس ادارے کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ یہ ۱۹۵۱ء - ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ اسکول کے ادھورے کمروں کی تعمیر فتح پور کے مشہور سیٹھ سوہن لال جی ڈگڑ نے اپنے خرچ پر مکمل کی۔

سنہ ۱۹۵۹ء میں اسکول کمیٹی کا رجسٹریشن ہوا۔ جس کے صدر مرحوم عبد الغفار خان پڑھیار اور سکریٹری مرحوم اصغر علی خان منشی جوڑ چنے گئے۔ ۱۹۶۱ء میں سرکار نے اسے تسلیم کیا اور گرانٹ منظور ہوئی۔ آزادی سے قبل سیکر کے راؤراجا کی جانب سے ۱۵-۲۰ روپے ماہانہ تعاون ملتا تھا، اب چار ماسٹروں

پر ۶۰ ر فیصد گرانٹ ملتی ہے۔

۱۹۸۷ء میں جب عبد الستار مولے خان پڑھیار کو سکریٹری بنایا گیا تب تک اسکول کی پرائمری حیثیت تھی۔ اس کے بعد سلیمان خان سر خیل کے خاندان والوں نے ۱۹۹۲ء میں پرانے تین کمروں پر تین کمرے اپنی طرف سے تعمیر کروائے تو اسے مڈل اسکول کی منظوری مل گئی۔ آج یہ سلسلہ جاری ہے۔

۱۹۹۹ء میں اسکول ہٰذا نے اپنا صد سالہ جشن منایا جس میں راجستھان کے راجیہ پال انشومن سنگھ جی اور راجستھان کے وزیر تعلیم بی ڈی کلّا نے بطور خاص شرکت فرمائی۔

اسکول کے اخراجات کی فراہمی کیلئے سب سے پہلے پونہ میں مقیم حاجی اصغر خان نربان نے ۱۹۶۰ء میں ممبئی میں ایک کمرہ خرید کر اسکول کے نام وقف کردیا جس کا کرایہ اسکول میں آنے لگا۔ اس کے بعد حاجی مرحوم حسین خان علی خان جوڈ (پونہ) نے ۱۹۶۵ء میں عیدگاہ اسکول کے کنویں پر ایک ٹنکی بنا کر واٹر سپلائی کا سلسلہ شروع کیا جس کی بھرپور آمدنی اسکول کے اخراجات کے لیے وقف کی گئی۔

۱۹۷۸ء میں اسکول کے مغربی جانب دوکانیں بنا کر کرایہ شروع کیا گیا۔ ۱۹۹۸ء میں جناب اصغر ٹھیکیدار، اسحاق سرخیل، غلام مرتضیٰ چوہان اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر یونس خان جوڈ نے چندہ جمع کر کے پچیس ہزار لیٹر کی ایک واٹر ٹینک بنائی اور محلہ کے گھروں میں پائپ لائن کے ذریعہ پانی پہنچایا۔ اس کی آمدنی اسکول کی فلاح اور ترقی کے لیے وقف ہے۔ ۱۹۷۸ء میں راجستھان کے وزیر اعلیٰ جناب بھیرون سنگھ شیخاوت نے اسکول کا دَورہ کیا تھا۔ اس وقت مرحوم عالم علی خان ایم ایل اے تھے۔ ان کی فہمائش پر اسکول کے بچوں کو کھیل کا میدان میسّر آیا جو بیکانیر ہائی وے پر نیتاجی عبد الغفار خان میموریل گراؤنڈ کے نام سے منسوب ہے۔

اسلامیہ اسکول عیدگاہ کی ادبی خدمات

یہ سچ ہے کہ اپنی سو سالہ زندگی میں اسلامیہ اسکول عیدگاہ کی جانب سے فنِ شعر و ادب کو فروغ دینے کے سلسلے میں کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ نہ کبھی کوئی مشاعرہ ہوا، نہ کسی ادبی موضوع پر کوئی سمینار منعقد کیا گیا۔ البتہ طلبہ کی ذہنی آبیاری کرنے کے لیے اسکول میں اکثر ثقافتی پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ پہلے بھی ہوا کرتے تھے۔ برسوں پہلے جب بارش اپنے وقت پر نہیں ہوتی تھی، دھرتی تانبے کی مانند جلنے لگتی تھی، کنوؤں سے پانی سوکھ جایا کرتا تھا، انسان پانی کے لیے ہراساں ہوجاتا تھا اور جانوروں کی زبانیں باہر نکل آتی تھیں، تب عیدگاہ اسکول کے معصوم بچوں کو بیہڑ کے ریگستان میں ننگے پیر اور کھلے سر، سلگتی

ریت پہ کھڑا کر کے بلند آواز سے "مناجاتِ باراں" پڑھائی جاتی تھی۔ اکبر وارثی کی لکھی ہوئی یہ مناجات 'مناجات اکبری' کے نام سے مشہور تھی۔ اُس وقت فتح پور کے بچے بچے کی زبان پر یہ مناجات تھی۔ یہاں تک کہ خواتین بھی گھروں میں اسے گنگنایا کرتی تھیں۔

مُناجات

اے مولیٰ کر کرم تیرا	حکم کر آبِ باراں کو
صبر اب اُٹھ گیا گیا میرا	حکم کر آبِ باراں کو
اے مولیٰ خشک ہے جنگل	چلا رحمت کے اب بادل
نہ کر تاخیر پرسوں کل	حکم کر آبِ باراں کو
اے مولیٰ جھاڑ سب سوکھے	قہر کی دھوپ سے سوکھے
تیری رحمت کے ہیں بھوکے	حکم کر آبِ باراں کو
اے مولیٰ خالقِ باری	ندی نالے تو کر جاری
ہوئے سب دور دشواری	حکم کر آبِ باراں کو

اس مناجات کی وجہ سے بھی کانوں میں ردیف اور قافیے کی گونج سنائی دیتی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ ہفتہ میں ایک بار بیت بازی کا مقابلہ ہوتا تھا۔ طلبہ مختلف قسم کے شعر یاد کر کے آتے۔ کچھ بچے شعر گھڑ کر بھی سنا دیا کرتے تھے۔ ایسے ہی طلبہ میں آگے چل کر جن بچوں نے شعر و سخن سے رشتہ استوار کیا ان میں نجمی فتح پوری، عنبر فتح پوری، نثار راہی، عادل فتح پوری، گوہر فتح پوری اور راقم الحروف کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اسلامیہ اسکول عیدگاہ فتح پور شیخاواٹی راجستھان کے جشن صد سالہ تقاریب کے تحت اسکول کی جانب سے اپنے سابق طالب علم شاعر و ادیب جناب نذیر احمد ابراہیم خان جوڑ المعروف بہ نذیر فتح پوری، مدیر اسباق (پونہ) کا اعزاز کیا گیا اور سپاس نامہ پیش کیا گیا۔

سپاس نامہ

فتح پور شیخاواٹی کے محلّہ زمینداران میں حاجی ابراہیم خان علیم خان جوڈ کے گھر پہلی اولاد کے طور پر یکم دسمبر ۱۹۴۶ء کو نذیر فتح پوری کی پیدائش ہوئی۔ یکم اکتوبر ۱۹۵۵ء کو اسکول کے ریکارڈ کے مطابق آپ نے تیسری کلاس میں داخلہ لیا جس کا رجسٹر نمبر ۱۵۳۵ ہے۔ اس کے بعد ۲۱ر مئی ۱۹۵۸ء کو درجۂ پنجم پاس کر کے آپ اسکول سے رخصت ہوئے۔

نذیر اور پونہ: بعد ازاں تلاشِ معاش کے سلسلے میں نذیرؔ اپنے وطن عزیز کو خیر آباد کہہ کر مہاراشٹر کے شہر پونہ میں چلے گئے۔ بقول شاعر

دوسرے ہوں گے جنھیں ہوتی ہے منزل کی تلاش　　اپنی جانب کھینچ لیتی ہے خود ہی منزل مجھے

مہاراشٹر کی وادیوں نے انھیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہاں جاکر بھی ان کے دل سے اپنے وطن کی یاد کم نہ ہوئی۔ ہجرت کے الم نے ان کے دل کی گہرائیوں میں اپنا ڈیرا جما لیا۔ وہ کرب، جو وطن کو خیر آباد کرتے ہوئے ان کے دل کو محسوس ہوا تھا وہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہا۔ تبھی تو نذیرؔ نے خود کو کبھی صرف نذیرؔ نہیں لکھا بلکہ 'نذیر فتح پوری' ہی کے نام سے خود کو متعارف کرایا۔ بقول شاعر

بڑی قسمت سے پاتا ہے کوئی پیغامِ قربانی　　پرائی آگ میں جل کر بشر منصور ہوتا ہے

فتح پور کے ہونہار ادبی سپوت

شیخاواٹی کے قدیم نوابی اور راجپوتی تہذیب و تمدن کا سنگم یہ فتح پور شہر ہر دور میں فنونِ ادب کا پروردہ اور گہوارہ رہا ہے۔ ہم اپنے ان سبھی فنکاروں پر ناز کرتے ہیں جنھوں نے اپنی فنکاری سے اپنے شہر کا نام عالم میں آشکارا کیا۔ نذیرؔ بھی ان میں سے ایک ہیں۔ جو آج بھی آسمانِ ادب پر آفتاب کی طرح اپنی کرنیں بکھیر رہا ہے۔ ان پر ہم جتنا فخر کریں کم ہوگا۔ نذیرؔ فتح پوری کا ہر اعزاز دراصل فتح پور ہی کا اعزاز ہے۔ چونکہ فتح پور کا نام ان کے ساتھ وابستہ ہے، اس لیے جو شہرت، نیک نامی اور ادبی احترام دنیائے ادب میں نذیرؔ فتح پوری کو حاصل ہے وہ فتح پور کو بھی حاصل ہے۔

مادرِ علمی عیدگاہ اسکول کے درخشندہ ستارے

اسکول ہٰذا کی خدمات کا اندازہ ادارے کی جانب سے منعقدہ صد سالہ تقریبات کے تحت منائے جانے والے عظیم الشان جلسوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ آج ہم اراکین اسکول اسکول کے ہونہار طالب علم اور درخشندہ ستارے نذیرؔ کو اپنے درمیان پاکر بہت خوش ہیں۔

آسمانِ ادب کے مردِ غازی

سندِ علم کے لیے نذیر کے پاس وہ ڈگری نہیں ہیں جو یونیورسٹی عطا کرتی ہے۔ مقولہ مشہور ہے

کہ "شاعر رحمان کا شاگرد ہوتا ہے۔ خدائے رحمٰن و رحیم نے نذیرؔ کو کسی سند کا محتاج نہیں رہنے دیا بلکہ خود نذیرؔ ہی کو مہر تصدیق بنادیا۔ وہ ادارے، وہ علماء جو اسناد پر دستخط کرنے کے مجاز ہیں انھوں نے بھی اپنے قلم سے نذیرؔ فتح پوری کو مہر تصدیق کا درجہ دیدیا ہے۔ ہندوستان کی مختلف اکیڈمیوں اور ادبی اداروں کی جانب سے نذیرؔ کی نثری اور شعری تصانیف کو جو انعامات اور ایوارڈ عطا ہوئے ہیں، ان سے بھی ان باتوں کا ثبوت ملتا ہے۔

اُردو کے ادبی رسائل واخبارات نے بھی نذیرؔ فتح پوری کے فن اور شخصیت پر خصوصی گوشے شائع کر کے انھیں بے پناہ خراج تحسین پیش کیا ہے۔

عید گاہ اسکول کے ایک سابق طالب علم جناب عادل فتح پوری نے نذیرؔ کی زندگی اور شاعری پر ایک کتاب 'نذیر فتح پوری: ایک دوست ایک شاعر' لکھ کر پورے شہر فتح پور کی جانب سے نذیرؔ کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

ہمارا نذیرؔ

ہم نذیرؔ کو یہ اعتماد دلاتے ہیں کہ نذیر ہمارا اپنا ہے۔ ہماری آنکھوں کا تارہ ہے۔ اور یہ کہ اسے جس قدر ہمارے تعاون کی ضرورت ہوگی ہم فراخ دلی سے، خندہ پیشانی سے اس کی انجام دہی میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ ہم دل کی گہرائیوں سے نذیرؔ فتح پوری کا پُر خلوص استقبال کرتے ہیں اور خیر مقدم کے ساتھ ہی یہ سپاس نامہ ادارے کی جانب سے پیش کرتے ہیں، جو ہمارے لیے وجہ صد افتخار ہے۔

بتاریخ یکم جون ۲۰۰۰ء بمقام اسلامیہ اسکول عید گاہ، فتح پور

منجانب: اراکین انتظامیہ، اسٹاف و ہمدردانِ اسکول عید گاہ فتح پور شیخاواٹی، راجستھان

اعزاز کے بعد راقم الحروف نے مندرجہ ذیل نظم کے توسط سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

صحن عید گاہ میں ایک نظم (از نذیرؔ فتح پوری)

آج پوشیدہ محبت نے نمایاں ہوکر — اپنے اظہار کا کیا خوب نکالا رستہ
روشنی آج بچھی جاتی ہے قدموں میں مرے — آج کس چاند نے بروقت اُجالا رستہ

آج اپنوں کی نوازش کا جو منظر دیکھا فرطِ جذبات سے آنکھوں کے کنارے بھیگے

آج یہ کس کی دعاؤں کا اثر کام آیا
تشنگی اوس کی بوندوں سے بجھی پھولوں کی

نکہتِ گل نے فضاؤں میں بکھیری خوشبو آج محسوس ہوئی خود مجھے اپنی خوشبو
اس سے پہلے بھی نوازا گیا اس بستی میں آج کی بات مگر اور ہی کچھ لگتی ہے
آج تو پیار کی شدت میں اضافہ دیکھا آج تو اوجِ ثریا پہ نصیبا دیکھا

اس بلندی سے بڑی اور بلندی کیا ہے

میرے احباب نے کندھوں پہ اٹھایا ہے مجھے منظر خواب حقیقت میں دِکھایا ہے مجھے

آج یہ کس کی دعاؤں کا اثر کام آیا
سوکھے ہونٹوں کی طلب آج ہوئی ہے سیراب

آج تو کھل کے گھٹا برسی ہے صحراؤں میں آج طغیانی نظر آتی ہے دریاؤں میں
بادباں کھول کے موجوں کے حوالے ہو جاؤں آج دل کرتا ہے موجوں میں کہیں کھو جاؤں

آج یہ کس کی دعاؤں کا اثر کام آیا
یادِ ماضی کے دریچوں میں کھڑا ہوں اس دم

میرے اندر کا وہ معصوم ہمکتا بچہ تتلیوں نے جسے رنگوں میں ڈبویا تھا کبھی
آج اس صحن میں پھرتا ہے شرارت کرتا آج اس منظر نایاب پہ قربان ہے دل

روشنی ننھے دماغوں کو دِکھانے والے
علم کے دیپ ہر اک گام جلانے والے
یاد آتے ہیں محبت سے پڑھانے والے

آج گھبرا کے زمانے کی المناکی سے مادرِ علم پناہوں میں تری آیا ہوں
بڑھ کے اب اپنے گلے سے تو لگالے مجھ کو اپنے شفقت بھرے آنچل میں چھپالے مجھ کو

☆

مادرِ علمیہ اسلامیہ اسکول عیدگاہ کی صد سالہ تقریب کے موقع پر خراجِ عقیدت از نذیرؔ فتح پوری

تو محبت کا ہے ایک گھر عیدگاہ

تو محبت کا ہے ایک گھر عیدگاہ — سب کی خاطر کھلے تیرے در عیدگاہ
تو ہے تعلیم کا اک شجر عیدگاہ — تیرے سائے میں بیتا ہے بچپن مرا
ہے تعارف مرا مختصر عیدگاہ — سب ترے نام سے جانتے ہیں مجھے
یہ ہے تیری دعا کا اثر عیدگاہ — ہے اثر مرے اشعار کا ہر طرف
میری سانسوں میں تیرا گزر عیدگاہ — میرے دل میں ہے مسکن تری یاد کا
مجھ کو آتی ہے اس میں نظر عیدگاہ — دیکھتا ہوں جہاں کوئی اسکول میں
میں نے بھوگے ہیں کتنے سفر عیدگاہ — پھر بھی بھولا نہیں تیرے دیوار و در
یاد تیری ہے 'تتلی کا پر' عیدگاہ — رنگ منظر دِکھاتی ہے ہر دم مجھے
شمس تھا کوئی کوئی قمر عیدگاہ — جتنے اُستاد تھے سب ہی تھے معتبر
تیرے درجوں میں سیکھا ہنر عیدگاہ — تیرے میدان میں کھیل کھیلے بہت
وہ چمکتے ہیں شام و سحر عیدگاہ — روشنی علم سے تیرے جن کو ملی

دور تجھ سے ہے تیرا نذیرؔ اب تو کیا
تجھ سے لیکن نہیں بے خبر عیدگاہ

☆☆

چند اساتذہ کے اسمائے گرامی جن کی محنت اور جد و جہد نے عیدگاہ اسکول میں بچوں کی تعلیم کا معیار بڑھایا تھا:

☆ پیر محمد حسین ہیڈ ماسٹر — ☆ قاضی نواب علی
☆ مرحوم طالب علی ماسٹر — ☆ مرحوم پیر اصغر علی ماسٹر

آزاد سینئر سیکنڈری اسکول

(آزاد سینئر سیکنڈری اسکول کی عمارت کا بیرونی منظر)

محلہ بیوپاریاں میں آزاد اسکول کا سنگِ بنیاد آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے رکھا گیا۔ ۱۹۹۱ء میں مذکورہ اسکول کا گولڈن جوبلی سال منایا گیا جس کی تقریبات شہر فتح پور کے علاوہ ممبئی میں بھی منائی گئیں۔ اس موقع پر ایک یادگار سوینیز بھی شائع ہوا تھا۔ اس جشن میں راجستھان کے اس وقت کے منسٹر بلرام جاکھڑ مہمانِ خصوصی کے طور پر شریک ہوئے تھے۔

اس اسکول کی ابتداء ایک مدرسے کی صورت میں ہوئی تھی۔ مدرسہ کا قیام مولوی حکیم حاذق محترم تمیز الدین خان صاحب کی سرپرستی میں مرحوم محمد حنیف ولد عبداللہ سولنکی کے مکان پر عمل میں آیا تھا۔ ابتداء میں مدرسے کے اخراجات پورے کرنے کیلئے چار چار آنے کے ممبر بنائے گئے۔ اس وقت مدرسہ کا کوئی علامتی نام تجویز نہیں ہوا تھا۔ کچھ دنوں بعد کرایہ کے مکان سے مدرسے کو مرحوم الٰہی بخش تھیلاسر والے کے باڑے میں منتقل کردیا گیا جہاں ان کے مویشیوں کو باندھا جاتا تھا۔ وہاں پتڑے کی ایک کھولی میں مدرسہ چلایا جانے لگا۔ اس کے بعد ۱۹۴۰ء میں ممبئی میں مقیم محلہ بیوپاریان کے جوانوں نے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی۔ "انجمن عقائد المسلمین" کے نام سے قائم کردہ اس تنظیم کے تحت مدرسے کو ترقی دے کر بڑی مسجد کے روبرو مرحوم گلاب الٰہی بخش سولنکی کی جگہ میں شروع کیا اور اس کا نام مدرسہ اسلامیہ اشرف العلوم رکھا گیا۔ اسی دوران مدرسے کی درجہ بندی کر کے درجہ چہارم تک تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ دستور مرتب کر کے انتظامی کابینہ کا انعقاد کیا گیا۔ مدرسہ دن بدن ترقی کرنے لگا۔ پھر محلہ کی ایک مخیّرہ مرحومہ جمن سکینہ زوجہ حاجی محمد الفو کھوکھر نے اپنے مرحوم شوہر کی خواہش کے مطابق ایک قطعہ اراضی مدرسے کیلئے وقف کردیا جہاں آج مدرسے کی خوبصورت عمارت ایستادہ ہے لیکن اُس وقت صرف گھاس پھونس کی چھپر ڈال کر بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔

۱۹۶۲ء میں جب محلہ بیوپاریان کے لوگ حصولِ معاش کے لیے کویت جانے لگے تو اس کے بعد محلہ کی ترقی کے ساتھ اس مدرسے کی ترقی بھی عمل میں آنے لگی۔ مخیّر حضرات نے اپنے اپنے طور پر پختہ کمرے بنانے کی ذمہ داری لے لی اور کرائے کے مکان میں جس مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ کامیابی کے مدارج طے کرتا ہوا آج ایک ترقی یافتہ اسکول کی صورت میں دنیا کے سامنے اپنی کامیابی کا علم بلند کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ضلع سیکر کے تعلیمی اداروں میں اس ادارے کی ایک الگ پہچان ہے۔

ایک ادنیٰ سے گھر میں جس مدرسے کی ابتداء ہوئی تھی آج وہ آزاد سینئر سیکنڈری اسکول کے نام سے شیخاواٹی کے ریگستانی اذہان میں تعلیم و تعلم کے دریا بہا رہا ہے۔

مدرسہ البنات فاطمۃ الزہرہ فتح پور

محلہ بیوپاریان حصولِ علم کے میدان میں مختلف طریقوں اور راستوں سے اپنی منزلیں تلاش کرنے کی کوشش میں ہمیشہ سرگرداں رہتا ہے۔ یہاں دینی تعلیم کے لیے بھی مدرسہ موجود ہے اور اعلیٰ پیمانے پر جاری ہے۔ خالص لڑکیوں کی تعلیم کے لیے 'ادارہ اتحاد بیوپاریان' کی سرپرستی میں مدرسہ فاطمۃ الزہرہ ایک خوبصورت اور وسیع عمارت میں جاری ہے۔ یہاں لڑکیوں کو میٹرک تک تعلیم دینے کا انتظام ہے۔ قرآن کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں بچیوں کو اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ حتی المقدور پردے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ معلمات بھی پردے کا اہتمام کرتی ہیں۔ اُردو کی
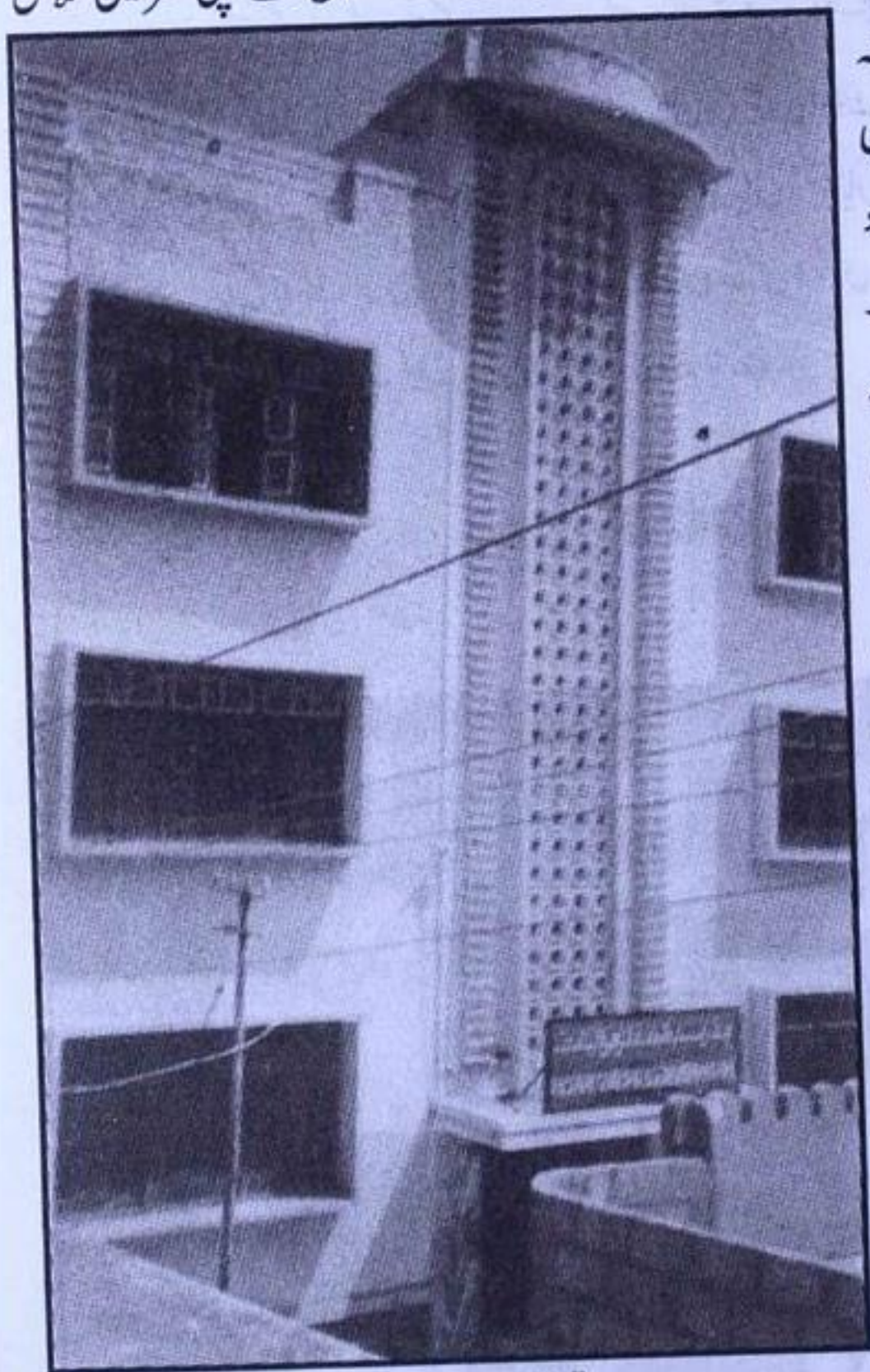
ترقی میں بھی اس مدرسے کا ایک رول رہا ہے۔ ۲۰۰۲ء میں راقم الحروف نے بنفس نفیس مدرسے کے نیاز حاصل کیے اور مرحوم جناب یعقوب سبحان کی رہنمائی میں مدرسے کے ہر کمرے کا معائنہ کیا اور طالبات سے ملاقات کی۔ جو قوم بیدار ہوتی ہے وہ حصول علم کی طرف دوڑتی ہے۔ اس کا ثبوت محلہ بیوپاریان میں قائم علمی اداروں کو دیکھ کر ملتا ہے۔ تعلیم کے فروغ کے لیے زرِ کثیر عطا کرنے والے اَفراد اور اس زرِ کثیر کو ایمانداری سے خرچ کرنے والے افراد جن اِداروں میں ہوتے ہیں، ان اِداروں کو کامیابی کا نشان پار کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

ریگستان کا جہاز

اونٹ کو ریگستان کا جہاز کہا جاتا ہے۔ کسی زمانے میں راجستھان میں سب سے زیادہ موثر اونٹ کی سواری ہوتی تھی۔ قائم خانی اور راجپوت برادریوں کی شان اونٹ کے بغیر اَدھوری ہے۔ فتح پور کے بازار میں آج بھی اطراف کے دیہاتوں سے جو اناج، سبزیاں، لکڑیاں اور دیگر سامان آتا ہے اور اونٹ پر ہی آتا ہے۔ سیاح اونٹ پر بیٹھ کر تصویر اُتارنے میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ ٹیڑھی میڑھی مخلوق جس پر سوار ہو کر ایک عجیب کیف و سرور کا احساس ہوتا ہے۔

(۱۹۶۵ء میں راجستھان کے وزیر آبپاشی جناب ہردیو جوشی، اسلامیہ اسکول عیدگاہ کی ٹنکی کا افتتاح کرنے کے بعد سامعین سے خطاب کرتے ہوئے۔ مرحوم حسین خان جوڈ بھی موجود ہیں۔)

چند اہم شخصیتیں

* مرحوم نیتاجی عبدالغفار خان پڑھیار
* عبدالستار خان پڑھیار
* مرحوم حاجی وزیر دھوبی
* مرحوم عبدالغنی وکیل
* شہر قاضی رضا محمد
* مستان بابا
* بہادر خان لنگا
* مرحوم قاضی رحمت اللہ
* مرحوم اصغر بھوان
* اصغر محمد خان ٹھیکیدار
* بابو پہلوان
* شوکت علی جوڑ
* مرحوم اصغر علی غلام رسول خان جوڑ
* محمد فاروق قریشی
* حکیم عثمان دھوبی
* مولوی عبدالسمیع صاحب
* مرحوم حاجی حسین خان جوڑ
* حاجی نور خان بھوان
* مرحوم یاسین خان پڑھیار
* مرحوم دین محمد جراح
* محمد یونس بھوان
* قاسم خان موئل
* محبوب خان دیوڑا

مرحوم نیتاجی عبد الغفّار خان پڑھیار

مرحوم عبد الغفار خان کی پیدائش ۱۹۲۱ء میں پٹیل غنی خان ولد حاجی مدار بخش خان کے گھر ہوئی۔ پانچ بھائیوں میں آپ سب سے چھوٹے تھے۔ سیکر کے راؤ راجا نے آپ کے والد کو فتح پور شہر کا پٹیل مکرر کیا تھا۔ عبد الغفار خان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ میں ہوئی۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک کچھی ناتھ ودھیالیہ فتح پور میں تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں شری کلیان ہائی اسکول سیکر میں داخلہ لے لیا۔ اس کے بعد پنجاب بورڈ سے دسویں کا امتحان دینے کے لیے ریواڑی کے کسی اسکول میں داخل ہوئے اور ۱۹۳۸ء میں یہ امتحان پاس کیا۔

آپ کے والد شہر کے پٹیل تھے، اس لیے گھر کا ماحول سیاسی تھا۔ سرکاری افسروں اور کارندوں سے میل جول تھا۔ آزادی کی تحریک چلی تو مہاتما گاندھی کے خیالات سے متاثر ہوئے اور گاندھی وادی بن گئے۔ اس طرح آزادی سے پہلے ہی آپ کانگریس میں شامل ہو گئے۔ آزادی کے بعد ۱۹۵۷ء میں آپ کو فتح پور سے کانگریس کا ٹکٹ ملا اور آپ ایم ایل اے چن لیے گئے۔ ۱۹۶۷ء میں بھی آپ نے کانگریس کے ٹکٹ پر چناؤ لڑا۔ کانگریس جب تقسیم ہوئی تو آپ اندرا کانگریس میں شامل ہو گئے اور 'جیل بھرو تحریک' میں شامل ہو کر جیل بھی گئے۔ آپ کے ایم ایل اے کے زمانے میں فتح پور میں بجلی آئی۔ آپ اسلامیہ اسکول عیدگاہ کے پہلے صدر بنائے گئے اور آپ کی کوششوں سے اسکول کو سرکاری امداد ملنے لگی۔

آپ کی زندگی سادہ اور گھریلو قسم کی تھی۔ کم بولتے، سیاست میں رہ کر سیاسی ہتھکنڈوں سے ناواقف تھے۔ غریب اور مزدور اور کسان قسم کے لوگوں کی خدمت کے لیے آپ ہمہ وقت تیار رہتے۔ آپ ضلع کی تمام ہندو مسلم برادریوں میں یکساں طور پر محترم تھے۔ سبھی آپ کی عزت کرتے۔ آپ اچھی سوجھ بوجھ کے مالک تھے۔ کسی بھی قومی اور سماجی مسئلہ سے سیاسی فائدہ کبھی نہیں اُٹھاتے۔ سیاسی کرسی سے آپ نے اپنا ذاتی فائدہ نہیں کیا۔ آپ اپنے کھیت کا کام اپنے ہاتھوں سے کرتے۔ آخری دنوں میں آپ نے اپنے خاندان کی پرورش کے لیے چونا بھٹہ اور اینٹ بھٹے کا کاروبار بھی کیا۔

آپ نے ایک مثالی زندگی جی اور ۲۴ر ستمبر ۱۹۷۸ء کو دل کا دورہ پڑنے سے آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کی یاد میں نیتاجی عبد الغفار خان یونانی اسپتال، غفار خان روڈ اور غفار خان گراؤنڈ بنائے گئے۔ آپ نیتاجی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آج بھی اسی نام سے آپ کو یاد کیا جاتا ہے۔

مرحوم اصغر علی غلام رسول خان جوڈ

مرحوم اصغر علی خان جوڈ کی شخصیت فتح پور کے سماجی، سیاسی اور تعلیمی حلقوں میں خاصی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ محلہ زمینداران میں آپ پہلے وکیل ہوئے۔ اردو زبان و ادب سے بھی آپ کو شغف رہا۔ طبیعت میں بردباری تھی، سنجیدگی تھی، نفاست تھی۔ سماج کے باہمی تنازعات سلجھانے میں آپ پیش پیش رہتے۔ آپ کی حویلی میں ملاقاتیوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ اطراف کے دیہاتوں سے بھی لوگ اپنے عدالتی کاموں کیلئے آپ کے پاس آتے۔ چونکہ مرحوم اور راقم الحروف ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اور دونوں کے گھر بھی برابر میں تھے اس لیے میں نے اپنے بچپن میں اصغر علی خان کی حویلی کے سامنے دیہاتوں سے آنے والے کسان اور جاٹوں کے اونٹ بندھے دیکھے ہیں۔ عمر میں مرحوم میرے والد صاحب سے بڑے تھے۔ لیکن رشتے میں میرے تایازاد بھائی تھے، اس لیے ہم سب انھیں 'بھائی صاحب' کہہ کر مخاطب کرتے۔ مَیں جب پونہ سے فتح پور جاتا تو دو ایک بار بھائی صاحب سے ملنے ان کی حویلی میں ضرور جاتا۔ وہ اپنی بیٹھک (جو حویلی کے بیرونی حصے میں واقع تھی) میں کچھ نہ کچھ لکھتے ہوئے ملتے۔ مئیں نے کرسی اور ٹیبل پر ان کو بیٹھے اور لکھتے کبھی نہیں دیکھا۔ چارپائی پر بیٹھ کر اس طرح لکھتے جیسے کاتب کتابت کرتا ہے۔ ملتے ہی مجھ سے پوچھتے 'تیری شاعری کا کیا حال ہے؟'

نیتاجی عبد الغفار خان کی عملی سیاست کو کامیاب کرنے کے لیے اصغر علی خان کا اہم کردار رہا ہے۔ لیکن مرحوم نے خود عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ البتہ تعلیمی خدمات کے لیے اسلامیہ اسکول عیدگاہ میں سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے۔

برادری میں آپ کا جتنا وقار تھا، برادری سے باہر بھی آپ اسی وقار سے یاد کیے جاتے تھے۔ آپ کے فرزند شوکت علی جوڈ اگر توجہ دیں تو آپ کی زندگی پر ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ جس طرح نیتاجی کی یادگار قائم کی گئی ہے اسی طرح آپ کی یادگار کے طور پر بھی کوئی اقدام کرنا چاہیے۔

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

بقول غلام حسین خان جوڈ، ان کی زندگی کو کامیاب بنانے اور انھیں زیورِ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کرنے میں بھائی صاحب اصغر کا بڑا حصہ رہا ہے۔

عبد السّتار خان پڑھیار

آپ کی پیدائش ۱۹۴۵ء میں فتح پور کے محلہ زمینداران میں مرحوم مولا بخش خان پڑھیار کے گھر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ اسکول عیدگاہ میں حاصل کی۔ آخر میں سیٹھ چمڑیا کالج فتح پور سے تعلیم پوری کر کے اپنے کاروبار میں لگ گئے۔ نیتاجی عبدالغفار خان آپ کے چچا تھے۔ اس کے باوجود سیاست میں دلچسپی نہیں لی اور تعلیمی میدان میں اپنی خدمات پیش کرنے کو اوّلیت دی۔ آپ فتح پور کی متعدد کمیٹیوں سے منسلک رہے لیکن اسلامیہ اسکول عیدگاہ کے کام کو آپ نے اہمیت دی۔ آپ نے ابتداء میں اسلامیہ اسکول عیدگاہ میں اُستادی کے فرائض بھی انجام دیے لیکن اس کے بعد معاش کا راستہ بدل دیا۔ آپ کی کوششوں سے عیدگاہ اسکول پرائمری سے میڈل تک پہنچا اور اسے سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا۔ سکریٹری کی حیثیت سے آپ عیدگاہ اسکول کی فلاح اور ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ اسکول کو مزید ترقی دینے کے لیے آپ نے کئی منصوبے بنا رکھے ہیں۔ اسلامیہ اسکول عیدگاہ کا سو سالہ جشن منانے میں آپ پیش پیش رہے اور اسے ہر طرح سے کامیاب کیا۔

محمد فاروق قریشی

محمد فاروق کی پیدائش آج سے تقریباً ۵۶ سال قبل فتح پور کے محلہ بیوپاریان میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم فتح پور میں حاصل کی۔ اس کے بعد جامعہ اُردو علی گڑھ سے ادیب کامل کا امتحان پاس کیا۔ آپ کو سماجیات کے میدان میں ابتداء ہی سے کام کرنے کا شوق تھا۔ عملی سیاست میں ۱۹۵۶ء میں آپ داخل ہوئے اور ہمیشہ کانگریس کے سرگرم ممبر رہے۔ ۱۹۸۰ء میں یوتھ کانگریس سیکر کے صدر بھی بنائے گئے۔ محمد فاروق ۱۹۷۰ء سے ۲۰۰۰ء تک میونسپل بورڈ کے ممبر رہے۔ آپ کی مقبولیت کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی کہ آپ نے تیس سال میں کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا۔ ۱۹۷۲ء میں آپ نے اندرا گاندھی کی گرفتاری پر خود کو جیل کے حوالے کیا۔ ۱۹۹۲ء سے آپ آزاد سینئر سیکنڈری اسکول محلہ بیوپاریان کے بلا معاوضہ سکریٹری کے عہدے پر فائز ہیں۔ بیوپاریان برادری کی فلاح و بہبود کیلئے آپ نے ہمیشہ خلوص سے کام کیا، اسی لیے برادری میں آپ کی عزت ہے۔

حاجی وزیر دھوبی

فتح پور کی دھوبی برادری میں حاجی وزیر کا نام خاصہ اہم اور ان کی سماجی خدمات قابلِ رشک ہیں۔ وہ غیر منقسم ہندوستان میں اس وقت امیر ہوئے جب فتح پور کے عام آدمی کو دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے نصیب ہوتی تھی۔ حاجی وزیر نے آزادی سے قبل اپنے اہل و عیال کی رہائش کیلئے جدید طرز کا ایک خوشنما بنگلہ بناکر لوگوں کو حیرتوں میں ڈال دیا تھا۔ اپنے بنگلے کے قریب ہی انھوں نے ایک خوبصورت مسجد بنائی تھی اور مسجد سے ملحق ایک مدرسہ اور کنواں بھی بنایا تھا۔ کسی زمانے میں اس مدرسے میں راقم الحروف بھی کچھ مہینوں کیلئے تعلیم حاصل کرچکا ہے۔ یہ مسجد اور مدرسہ آج بھی موجود ہیں۔ 'دھوبیوں کی مسجد' کے نام سے مشہور ہے۔ آپ اسلامیہ اسکول عیدگاہ کے ابتدائی دَور میں انتظام کاروں میں بھی رہے ہیں۔

حکیم عثمان دھوبی

حکیم عثمان دھوبی مرحوم کو مَیں نے اس وقت دیکھا ہے جب میں دھوبیوں کی اسکول میں زیر تعلیم تھا۔ حکیم صاحب کے فرزند حکیم محمد شفیع ان دنوں جوان تھے۔ ان سے بھی اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ حکیم عثمان اپنے وقت میں اہم شخصیت کے مالک تھے۔ سیاسی اور سماجی حلقوں میں آپ کی ذات اور آپ کی بات کی قدر تھی۔ آپ اسلامیہ اسکول عیدگاہ کے صدارتی عہدے پر بھی فائز رہے۔ فتح پور میونسپل بورڈ میں آپ پہلے چیئرمین ہوئے ہیں۔ اردو زبان و ادب سے بھی آپ کو شغف تھا۔ آپ کے فرزند حکیم محمد شفیع آج اپنے والد کے نقشِ قدم پر رواں دواں ہیں۔

مرحوم عبدالغنی وکیل

مرحوم عبدالغنی وکیل کا تعلق تیلی برادری سے تھا۔ مسلمانوں میں آپ پہلے وکیل ہوئے ہیں۔ انتہائی سنجیدہ طبیعت پائی تھی۔ فتح پور بازار کے سکریا چوراہے پر کیشاپان والا کی دوکان کے برابر ان کی دوکان تھی۔ چمڑے کا کاروبار تھا۔ مسلمانوں کے تعلیمی اور ملی مسائل کو حل کرنے میں ذاتی دلچسپی دِکھاتے تھے۔ میں نے اپنے بچپن میں اکثر ان کو دوکان پر بیٹھے دیکھا ہے۔

مولوی عبدالسمیع صاحب

مولوی عبدالسمیع صاحب محلّہ قاضیان میں رہائش پذیر تھے۔ مسجد قاضیان کے ایک کمرے میں مطب بھی لگاتے تھے۔ سرکاری اسکول میں اُردو کے اُستاد بھی تھے۔ عالم و فاضل تو تھے ہی، شعر وادب سے بھی شغف رکھتے تھے۔ عشرت دھولپوری کے حوالے سے مَیں نے ابتداء میں جس مشاعرے کا ذکر کیا ہے اس کی صدارت مولوی صاحب ہی نے فرمائی تھی۔ اکثر دینی محفلوں میں آپ خطاب فرماتے۔ وعظ و نصیحت کرتے۔ شہر میں آپ کا ایک اہم مقام تھا۔ لوگ احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ان کے جیسا عالم دین محلّہ قاضیان میں پیدا نہیں ہوا۔

شہر قاضی رضا محمد

قاضی رضا محمد نے تاحیات مسجد محلّہ زمینداران میں فی سبیل اللہ امامت کے فرائض انجام دیے۔ آپ کو شہر قاضی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ عید اور بقر عید کی نمازوں کے بعد تلک (ایک قسم کا شاہی لباس) پہن کر گھوڑے پر سوار ہو کر عید گاہ سے آپ ایک جلوس کی صورت میں پورے محلّہ کا گشت کرتے اور اپنی دعاؤں سے عوام کو نوازتے۔ آپ حقیقی معنوں میں ایک فقیر کامل تھے۔ گھر کا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتے حتی کہ گھر کی لیپا پوتی بھی آپ اپنے ہاتھ سے کرتے۔ آپ نے ساری زندگی صبر وقناعت میں بسر کی۔ میرے بچپن کے زمانے میں مَیں نے دیکھا کہ آپ صرف ایک روپے ہدیہ کے عوض 'محفل میلاد' بڑی خوشی سے پڑھ دیا کرتے تھے۔ اکثر ان محفلوں میں مَیں ان کے ساتھ رہا ہوں۔ فتح پور ہی میں انتقال ہوا۔

مرحوم حاجی حسین خان جوڈ
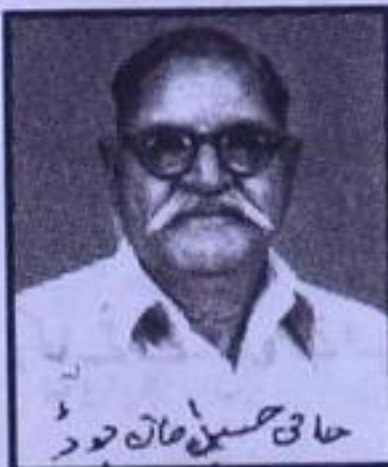
حاجی حسین خان جوڈ

حاجی حسین خان جوڈ کا انتقال پونہ میں ہوا۔ آپ نے زندگی کے سو سال پورے کیے۔ فتح پور میں ۱۹۶۵ء کے آس پاس آپ نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کام یہ کیا کہ عید گاہ اسکول کے کنوئیں کے ساتھ واٹر سپلائی کی غرض سے ایک ٹنکی بٹھا کر مشین لگوادی۔ اس سے پورے محلّہ کیلئے پانی کی فراہمی کا کام ہونے لگا۔ اس کی آمدنی اسکول کی فلاح و بہبود کیلئے خرچ ہونے لگی۔ حاجی حسین خان جوڈ ایک رنگا رنگ طبیعت کے مالک تھے۔ خود ہنستے رہنا اور دوسروں کو بھی ہنساتے رہنا ان کی

عادت میں شامل تھا۔ رشتے میں وہ میرے بھائی ہوتے تھے۔ پونہ کے ایروڈا قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔

مستان بابا

مستان بابا کا نام امیر عبد اللہ ہے۔ آپ نے برسوں فتح پور کے محلہ زمینداران میں پنواروں کی حویلی کی بیٹھک میں قیام فرماتے تھے۔ آپ کے حلقے میں جوانوں کی کثرت رہی۔ آپ مجذوب طبیعت کے انسان ہیں۔ خدا نے فن طغرانویسی کی دولت سے آپ کو مالا مال کیا ہے۔ اہالیانِ فتح پور کے گھروں کے آپ نے بنائے طغرے آویزاں ہیں۔ آپ نے اپنے ہنر کو تجارت نہیں بنایا۔ حصولِ زر کی طمع آپ کو کبھی نہیں رہی۔ فقر آپ کی طبیعت میں کثرت سے ملتا ہے۔ عرصہ ہوا آپ نے جے پور کو اپنا مسکن بنا رکھا ہے۔ وہاں ڈاگر بندھو کے مہمان ہیں۔ فتح پور سے آج بھی اکثر لوگ ان سے نیاز حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں۔

حاجی نور خان بھوان

حاجی نور خان بھوان ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ ممبئی میں عمارت سازی کا کام کیا۔ خدا نے مالی اعتبار سے کامیاب کیا تھا۔ خود تعلیم کی دولت سے محروم رہے لیکن قوم کی بچیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کا جذبہ ہمیشہ دل میں رہا۔ ۱۹۴۲ء میں جب مرزا اسمٰعیل بیگ عیدگاہ اسکول کے معائنے کیلئے تشریف لائے تو آپ نے اپنی ایک زمین اسکول کو وقف کر دی تھی۔ آج ساٹھ سال کے بعد اس زمین پر کمروں کی تعمیر عمل میں آ رہی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں آپ نے محلہ زمینداران کی مسجد کے برابر لڑکیوں کا ایک مدرسہ بنایا۔ جب تک زندہ رہے مدرسے کا خرچ اپنی جیب سے چلاتے رہے۔

بہادر خان لنگا

بہادر خان لنگا نے عیدگاہ اسکول کے قیام کیلئے سب سے پہلے دو پختہ کمرے بنا کر وقف کیے۔ یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ آج بھی دونوں ابتدائی کمروں کے درمیان بہادر خان لنگا کے نام کا پتھر نصب ہے جس سے حقائق کا پتہ چلتا ہے۔

مرحوم یاسین کالو خان پڑھیار

یاسین خان پڑھیار کی زندگی کا بیشتر حصہ ممبئی میں گزرا۔ یہاں آپ عمارت سازی کا کام کرتے تھے۔ آپ لاٹھی کے عمدہ کھلاڑی تھے۔ اکھاڑے کے داؤ پیچ سے خوب واقف تھے۔ محلہ زمینداران میں لاٹھی گھمانے میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا۔ فتح پور کے متعدد جوانوں کو آپ نے اپنی شاگردی میں لے کر حربی داؤ پیچ سکھائے تھے۔ آپ کے انتقال کے بعد اس محلہ میں اب کوئی لاٹھی کا اُستاد باقی نہیں رہا۔

مرحوم قاضی رحمت اللہ

قاضی رحمت اللہ ابتداء میں دھوبیوں کی اسکول میں اُستادی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ میں اس زمانے ہی میں وہاں طالب علم تھا۔ گرم مزاج تھے۔ طلبہ کو سخت سزا دیتے تھے۔ پٹائی کرتے وقت چہرہ غصے سے اُبل پڑتا تھا۔ رنگ گورا تھا، چہرے پر ہمہ وقت پسینے کے قطرے جھلملاتے رہتے تھے۔ پیدل چلنے کی عادت تھی۔ وقت سے پہلے اسکول سے الگ ہونا پڑا۔ اس کے بعد غیر سرکاری پوسٹ مین کی ذمہ داری سنبھالی۔ محلہ کی ڈاک پوسٹ آفس سے لاتے۔ محلہ میں تقسیم کرتے۔ چونکہ عموماً خواتین ناخواندہ تھیں، اس لیے خط بھی خود ہی پڑھ کر سناتے اور جواب بھی اسی وقت لکھ کر سپردِ ڈاک کر دیتے۔ ممبئی، پونہ، ناسک اور دیگر شہروں میں بسنے والوں کے منی آرڈر بھی قاضی صاحب ہی کے نام آتے اور وہ اس امانت کو ایمانداری کے ساتھ گھروں میں تقسیم کر دیتے۔ یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔

مرحوم اصغر خان مولے خان بھوان

اصغر خان بھوان کی پیدائش ۱۹۳۰ء میں فتح پور میں ہوئی۔ آپ کو اُردو اور انگریزی پر عبور حاصل تھا۔ مرحوم نے اپنے اہل و عیال اور خاندان والوں کیلئے ایک انقلابی شخصیت کا کردار ادا کیا۔ آپ جہاں دیدہ انسان تھے۔ ہوا کا رُخ سمجھ کر اسے موڑنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ گفتار کے ساتھ ہی کردار کے بھی غازی تھے۔ سنجیدگی اور بردباری ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ قائم خانی سماج میں آپ کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ سماج کو جوڑنے میں آپ نے اہم رول ادا کیا ہے۔ آپ نے ایک سیلانی کی طرح حیدر آباد، اورنگ آباد، الہ آباد کے علاوہ

عراق، سعودیہ اور بحرین کا سفر کیا۔ پونہ بھی اکثر آتے رہے ہیں۔ فتح پور میں ۲۴ر اپریل ۲۰۰۲ء کی شام آپ کا انتقال ہوا۔ جنازے میں شیخاواٹی کے تمام شہروں اور قصبوں سے لوگوں نے شرکت کی۔

مرحوم دین محمد جراح

مرحوم دین محمد جراح نے جراحی میں نام کمایا۔ جن مریضوں کو ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دیا وہ دین محمد کی جراحی سے صحت یاب ہوئے۔ ناسور کا علاج کرنے میں تو کمال حاصل تھا۔ شہر میں مقبول تھے۔ مناسب اُجرت کے بدلے عوام کی مسیحائی کرتے تھے۔ لالچ اور زر کی طلبی نے کبھی پاؤں میں زنجیر نہیں ڈالی۔ ان کے بعد ان کے فرزند یاسین جی نے بھی اسی کام کو اپنایا۔

محمد یونس بھوان

محمد یونس بھوان محلہ عیدگاہ میں نور صاحب بھوان کے گھر پیدا ہوئے۔ ممبئی میں اپنے والد مرحوم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عمارت سازی ہی کو حصولِ معاش کا ذریعہ بنایا۔ خدا نے جب فراغت و فراوانی عطا فرمائی تو آپ نے قومی اور سماجی کاموں میں دل کھول کر حصہ لیا۔ آپ نے عوامی فلاح کیلئے ایک سڑک بنائی۔ یہ سڑک مسجد درِ دولت بازار سے شروع ہو کر عیدگاہ اسکول کے پیچھے مدنی مسجد کے پاس ختم ہوتی ہے۔ اس سڑک کا نام آپ کے مرحوم والد "حاجی نور خان بھوان" کے نام سے منسوب ہے۔ یونس بھوان تعلیمی میدان میں بھی تعاون دیتے رہتے ہیں۔ خاندان کیلئے، قوم کیلئے، وطن کیلئے آپ نے اپنے والد محترم ہی کے نقشِ قدم پر چل کر ان کی روایتوں کو زندہ رکھا ہے۔ یونس بھوان ایک ملنسار اور مخلص انسان بھی ہیں۔ جو سڑک آپ کے تعاون سے تیار ہوئی اس کی تکمیل کی تاریخ ۹۷-۷-۳۱ ہے۔

اصغر محمد خان ٹھیکیدار

آپ کی پیدائش ۱۹۵۳ء میں حاجی محمد خان پڑھیار کے گھر ہوئی۔ آپ ایک بزنس مین کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ فتح پور کے سماجی، سیاسی حلقوں میں آپ کا خاص اثر ہے۔ پچھلے پندرہ سال سے آپ مسلسل اپنے حلقے

سے میونسپل بورڈ الیکشن میں کامیاب ہوتے چلے آرہے ہیں۔ آپ فلاح المسلمین کے رُکن بھی ہیں۔ ۱۹۸۳ء سے آپ کانگریس کے سرگرم رکن ہیں۔ آپ راجپوت کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۷ء تک اپنی خدمات پیش کرچکے ہیں۔ مشاعروں اور ادبی کاموں کے انعقاد کیلئے بھی آپ کوشاں نظر آتے ہیں۔ عیدگاہ واٹر سپلائی کیلئے نئی ٹنکی بنانے اور ہر گھر میں بھرپور پانی پہنچانے میں آپ نے اہم رول ادا کیا ہے۔ اسحاق سرخیل اور دوسرے احباب نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ آپ ایک خاموش طبیعت شخص ہیں۔ ۲۷ر مئی ۲۰۰۰ء کو جب شبیر فراز کی کوششوں سے راقم الحروف کو اعزاز دیا گیا تو آپ نے ان کو ڈھائی ہزار کی مالا پہنائی۔

قاسم خان موئل
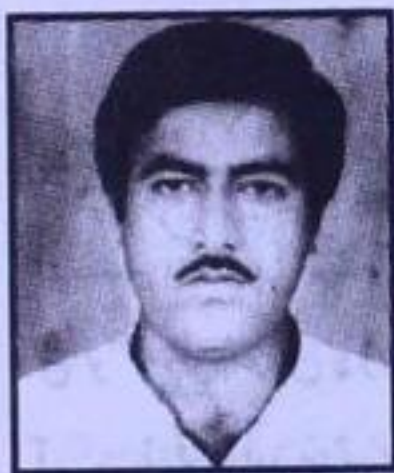
فتح پور کے سیاسی اور سماجی حلقوں میں قاسم خان کا نام کسی بھی رسمی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ سیاسی میدان میں وہ ایک عرصہ سے سرگرم ہیں اور فتح پور میونسپل بورڈ کے رکن کی حیثیت سے کامیاب بھی ہوچکے ہیں۔ آپ کی کوششوں سے محلہ میں چیتی کے کنویں کے پاس ایک مدرسے کا قیام بھی عمل میں آچکا ہے۔ مدرسہ کی پختہ عمارت آپ ہی کی کوششوں سے مکمل ہوئی ہے۔ ۲۷ر مئی ۲۰۰۰ء کو جب شبیر فراز کی کوششوں سے منصور چوروی کو اعزاز دیا گیا تو قاسم خان موئل نے منصور صاحب کو ۲,۵۰۰ روپے کی مالا پہنا کر ان کا استقبال کیا۔ آپ دیگر قومی کاموں میں بھی حصہ لیتے رہتے ہیں۔

بابو پہلوان

بابو پہلوان کا نام شمشاد حسین ہے۔ آپ کی پیدائش فتح پور کے پیر گھرانے میں ہوئی۔ آپ کا خاندانی سلسلہ ہانسی کے بزرگ چار قطب والوں سے ملتا ہے۔ فتح پور کے نواب چار قطب والوں سے بیعت تھے۔ بابو پیر کے آباء و اجداد بھی نوابوں ہی کے ساتھ ہانسی سے یہاں آکر آباد ہوگئے تھے۔ بابو پیر، بابو پہلوان کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ فتح پور کے واحد پہلوان ہیں جن کو شیخاواٹی کے اکھاڑوں میں کسی بھی پہلوان نے شکست نہیں دی۔ آپ نے جب بھی کشتی لڑی کامیاب رہے۔ ان دنوں آپ ایک اسکول شری کرشن پاٹھ شالہ کے منتظم ہیں اور تعلیم کے میدان میں اپنی خدمات پیش کررہے ہیں۔

محبوب خان دیوڑا

محبوب خان دیوڑا کی پیدائش دیوڑا خاندان میں ہوئی۔ آپ کے والد حاجی منور کریم خان دیوڑا ابتداء ہی سے پونہ میں مقیم تھے۔ لہٰذا محبوب خان بھی اپنے والد کے ساتھ مل کر اپنا آبائی کاروبار کرنے لگے۔ آپ نے فتح پور میں اپنے اہل و عیال کی رہائش کیلئے ایک جدید طرز کی کوٹھی تعمیر کی ہے۔
قومی، سماجی اداروں میں ایک معاون کی حیثیت سے آپ نے ہمیشہ اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔ فتح پور کی عیدگاہ اسکول ہو یا واٹر سپلائی کیلئے بنائی گئی ٹنکی، کسی مسجد کی تعمیر کا کام ہو یا مدرسے کا، آپ ہر جگہ حاضر رہتے ہیں۔ پونہ میں دو سال قبل کلوڑلوہ گاؤں کے علاقے میں نئی بستی کیلئے آپ نے ایک مسجد اپنے ذاتی خرچ پر تیار کی اور نمازیوں کیلئے سہولت فراہم کی۔ فتح پور کے سیاسی حلقوں پر بھی آپ کی شخصیت اثرانداز رہی ہے۔ فتح پور میں مسجد بساطیان کی ازسرنو تعمیر کا کام بھی آپ ہی نے مکمل کیا۔

شوکت اصغر خان جوڈ

ایک زمانہ تھا جب شیخاواٹی کے لوگ ممبئی اور پونہ آنے کے لیے سوائی مادھوپور تک کا سفر اونٹوں پر کرتے تھے۔ یہ سفر ہفتے عشرے میں طے ہوتا تھا۔ اس کے بعد سوائی مادھوپور سے ممبئی کے لیے ریل ملتی تھی۔ لیکن اب ایسی کوئی دِقت نہیں ہے۔ پچھلے بیس پچیس برسوں میں تو شیخاواٹی کے لوگ نہ صرف ممبئی پونہ بلکہ مشرقِ وسطیٰ میں جا کر بس گئے ہیں۔ یہاں کے باشندوں کو ویزا اور ٹکٹ کی فراہمی سے لے کر اچھی کمپنی میں کام مہیا کرنے کا فریضہ بہت سے لوگوں نے انجام دیا لیکن ان سب میں نمایاں کام جناب شوکت اصغر خان جوڈ نے کیا۔ شوکت نے صرف اپنے خاندان اور قرابت داروں ہی کو روزگار پر نہیں لگایا بلکہ اپنے اِردگرد کی سبھی غریب برادریوں کے نوجوانوں کو چن چن کر کام پر لگایا اور روزگار فراہم کیا۔ شوکت نے یہ سارا کام خلوص کے ساتھ کیا۔ کبھی اپنے فائدے کی نہیں سوچی۔ اس طرح بہت سے گھروں سے غریبی دور ہوئی اور خوشیوں کے چراغ جگمگانے لگے۔ خوشی کی بات ہے کہ جوڈ برادری کے ایک شخص نے اپنی برادری اور خاندان سے اوپر اُٹھ کر دوسرے لوگوں کے لیے بھی خوشی اور خوشحالی کی راہ ہموار کی اور اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیا۔

کتابیات

۱- تذکرہ شعرائے جودھپور۔ از شین کاف نظام

۲- تذکرہ شعرائے بیکانیر۔ از عزیز آزاد

۳- نذیر فتح پوری: ایک دوست ایک شاعر۔ از عادل فتح پوری

۴- سہ ماہی اسباق، پونہ۔ مدیر نذیر فتح پوری

۵- برف کی فصلیں، شعری مجموعہ۔ عزیز فتح پوری

۶- قائم خان راسا۔ جان کوی

۷- فتح پور کا اتہاس۔ رام گوپال ورما

۸- نخلستان سہ ماہی۔ جے پور

۹- ہفت روزہ فرمان، کراچی۔ اپریل ۱۹۹۱ء

۱۰- دیوانِ نجم ۱۱- دیوانِ سرور

۱۲- ہزار رنگ، شعری مجموعہ۔ دلدار ہاشمی

۱۳- نیا دن پھوٹ کر نکلا، شعری مجموعہ۔ نذیر فتح پوری

۱۴- جذباتِ آوارہ، شعری مجموعہ۔ محمد بخش آوارہ

۱۵- مدھیہ یوگین ہندی کے صوفی اِتر مسلمان کوی۔ ڈاکٹر ادے شنکر سری واستو

۱۶- صوفی کاویا سنگرہ ۔ آچاریہ پرشورام چترویدی

۱۷- راجستھان میں غزل گو شعراء ایک تعارف۔ مرتب: عبدالحیٔ، جلد اوّل، اگست ۱۹۹۴ء

۱۸- سہ ماہی نخلستان جے پور۔ "کل ہند اردو کنونشن نمبر" جلد ۱۳، شمارہ ۲، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۲ء

۱۹- تخلیقات۔ مرتب ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی۔ ۱۹۸۷ء

۲۰- راجستھانی زبان۔ مرتب عبدالحفیظ باحلیم، کراچی، ۱۹۹۴ء

۲۱- راجستھان میں نئی غزل کا سفر۔ شاہد پٹھان

۲۲- اسباق سالِ اوّلیں نمبر، مدیر نذیر فتح پوری ۲۳- ہمارا کل اور آج۔ مدیر اکبر قاسمی

۲۴- سہ ماہی اسباق، پونہ۔ شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۰ء۔ مدیر نذیر فتح پوری

۲۵- ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ از وید پرکاش گرگ ۲۶- فخر التواریخ

۲۷- انجمن اصلاح عقائد المسلمین، آزاد سینئر سیکنڈری اسکول، گولڈن جوبلی میگزین ۱۹۹۱ء

Nazeer Fatehpuri, no doubt, has been the most successful Urdu writer of India. Poetry is not only art Nazeer Fatehpuri is gifted with. The writer is also a talented story writer, critic, researcher and an editor of quarterly 'Asbaque'.

"Tarikh wa Tazkira-e-Fatehpur Shekhawati" is the research work of Nazeer Fatehpuri which is associated with five hundred years literary history of Fatehpur, Shekhawati, Rajasthan. This is the first book in Urdu of its kind which is focussing poets of Fatehpur including Akbar's wife Taj Kawitri.

Sanjay Godbole

Tarikh wa Tazkira-e-Fatehpur Shekhawati

by : Nazeer Fatehpuri

Price : Rs. 160/-

ASBAQUE PUBLICATIONS

Saira Manzil, 230 / B / 102, Viman Darshan,
Sanjay Park, Lohgaon Road,
Pune - 411 032 (M.S.) Ph. : 6687138

MADNI GRAPHICS, 6122855